مقدمہ تاریخ افکار و سیاسیات اسلامی

اسلام کے سیاسی اور معاشی پروگرام پر مفصل بحث اور دیگر نظام ہائے رائج الوقت کے ساتھ موازنہ، اس کی عملی حیثیت پر ماضی اور عہد حاضر کی روشنی میں بحث، خلافت راشدہ کے بعد اس کے انحطاط کے اسباب پر تنقید اور مسلمانوں کے علمی و تمدنی کارناموں کی مختصر توضیحات

از

عبدالوحید خاں

(مصنف مسلمانوں کا ایثار اور آزادی کی جنگ اور تاریخ افکار و سیاسیات اسلامی)

مکتبہ ایوان ادب نیلہ گنبد لاہور

ناشر
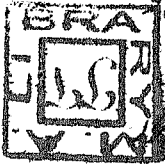
یونائٹڈ پبلشرز۔ چوک انارکلی لاہور

قیمت ۸ر

تعارف
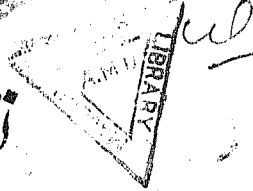
نظامِ نو" تاریخ افکار و سیاسیات اسلامی کا مفصل مقدمہ ہے۔ چونکہ اصل کتاب میں ان تمام اسباب و عوامل پر تنقید کی گئی ہے۔ جو اسلامی نظام اجتماعی کے انحطاط کے ذمہ دار ہیں۔ بالخصوص ملائیت، ملوکیت اور رہبانیت کے مضر اثرات کو آشکار کیا گیا ہے۔ نیز ان تمام عجمی افکار و تخیلات کو واضح کیا ہے جو اسلامی سیاسیات وعلوم بالخصوص تفسیر قرآن حدیث، فقہ و فلسفہ اور عام طرز حیات پر اثر انداز ہوتے ہیں اور جنہوں نے اسلامی نظام کو گھن کی طرح کھا لیا۔ جس کے نتائج تقلید کورانہ، قدامت پرستی، مذہبی گروہ بندی اور فرقہ پرستی، فقدان اجتہاد و جہاد، اور تباہ کن خانقاہیت کی شکل میں نمودار ہوئے! اور جو بالآخر اسلام کے مکمل زوال اور مسلمانوں کی تباہی کے باعث ہوئے

اس لیے :-

اس کی ضرورت تھی کہ اسلام کے ثباتی اور تعمیری پہلو کو پہلے پیش کر دیا جائے جو نصب العین کی شکل میں سامنے رہے اور نقد و نظر کیلئے کسوٹی کا کام دے تاکہ ناظرین خود فیصلہ کر سکیں کہ بیرونی اثرات کن راستوں سے داخل ہوتے اور ان کی ضرب کن مقامات پر پڑی۔ ا ین کے ساتھ اس نظام کے تاریخی پہلوؤں اور انحطاط کے اسباب

پر اور باوجود انحطاط کے مسلمانوں کے علمی اور تمدنی کارناموں پر بھی مختصر روشنی ڈالی گئی ہے۔

تاریخ افکار و سیاسیات اسلامی یونائیٹڈ پبلشرز چوک انارکلی، لاہور اور مکتبہ ایوان ادب ملحق سنٹرل آرمس اینڈ آٹو اسٹورس، نیلہ گنبد لاہور سے مل سکتی ہے۔ حجم ۵۳۴ صفحات، قیمت علاوہ محصول ڈاک ہے
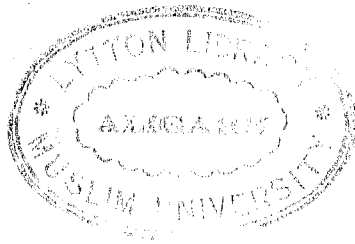
(استقلال پریس لاہور)

فہرست مضامین نظام نو

پیش لفظ

(از عبدالوحید خاں)

نظام نو کی عملی حیثیت

کتابِ ملتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا

مغرب کی جدید روشنی علم و ہنر، حکمت و تمدن اور آزادیٔ فکر و وسعت نظر کی تخلیق و ارتقاء میں اسلام کا جو حصّہ ہے اس کا اعتراف اکثر مغربی مفکرین و مورخین نے کیا ہے۔ وہ مانتے ہیں کہ انسانی افکار کو نہ وہ آزادی نصیب ہوتی نہ مساوات و رواداری کا نصب العین، اور نہ یہ تہذیب و تمدن کا نمونہ جو عصر حاضر کا طغرۂ امتیاز ہے اگر اسلامی تعلیمات مرکز اسلام سے گزر کر مصر، مراقش اور اسپین کی راہ سے یورپ میں داخل نہ ہوتیں۔ مغرب کا جدید فلسفۂ عمل، طرز سیاست اور جمہوریت کا موجودہ نصب العین اسلامی تعلیمات کے دھندلے نقوش ہیں جن پر آج دنیا گامزن ہے لیکن اس کے نظام کو مجموعی حیثیت سے بروئے کار نہ لانے کی وجہ سے وہ نتائج اب تک مفقود ہیں جن کی تلاش میں ہر صاحب فکر پریشان و سرگرداں ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اب تک مغربی مفکرین نے اسلام کے دینی نظام اجتماعی کو محض سطحی نظر سے دیکھا اور صرف چند نظریات کو اس کے اصل نظام سے علیحدہ کر کے قبول کر لیا۔

اس بے توجہی اور تعصب کا سبب ایک غلط فہمی ہے جو ہمارے جدید مفکرین میں پیدا ہوگئی ہے وہ یہ ہے کہ جو نظام اپنی آفرینش کے پچاس سال بعد ہی انحطاط پذیر ہوگیا۔ وہ آج کس طرح استحکام حاصل کرسکتا ہے؟ موجودہ دور ایک وسیع تجربہ گاہ ہے۔ جس میں ہر مسئلہ ٹھوس عمل کی کسوٹی پر جانچا جاتا ہے، اس لئے ان کے نزدیک جس نظام کی عمر اب سے تیرہ سو برس قبل اتنی مختصر ثابت ہوچکی ہو، وہ اس عہد میں کیسے ثابت و کامیاب ہوسکتا ہے؟

اسلامی علماء و مفکرین نے اس قسم کے اعتراضات کو ہمیشہ نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھا اور نہایت تحکمانہ انداز سے معترضین کے ساتھ خطاب کیا جس سے ان کی ناآشنائی اور بیگانگی بجائے کم ہونے کے بڑھتی گئی۔

ہمارے ارباب فکر کا طرز عمل اس معاملے میں نہ صرف غیر مصالحانہ رہا ہے بلکہ وہ سرے سے اس کو تسلیم ہی نہیں کرتے کہ اسلام کا نظام کبھی ختم ہوا وہ اسلام کے قوانین، فوجداری، وراثت اور حقوق العباد کے چند مسائل کو مکمل نظام سمجھ کر ان تمام مسلم حکومتوں کو اسلامی حکومتوں سے تعبیر کرتے ہیں۔ جہاں اس قسم کے قوانین جن کو وہ "قوانین شریعت" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ رائج رہے ہیں۔ یا اب نفاذ پذیر ہیں۔ ان میں سے اکثر کے نزدیک ملوکیت و نظام شہنشاہیت نہ صرف جائز بلکہ اوقات مستحسن ہے۔ نہ صرف ہارون و مامون بلکہ محمود غزنوی اور محمد تغلق تک کی حکومتیں ان کے نزدیک اسلامی ہیں اور انہوں نے ان کے نام کو خلد اللہ ملکہ کی دعاؤں کے ساتھ خطبے میں پڑھنا روا رکھا ہے کیونکہ ان میں حدود شریعت نافذ تھیں۔ ان کے اس طرز عمل کی روشنی

میں اسلامی نظام کے خلاف جو تعصب پیدا ہو سکتا ہے وہ ظاہر ہے، اور
اس کے دور کرنے کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ مسلمان اس حقیقت کا غیر
مبہم اور واضح طور سے اعلان کر دیں کہ اگرچہ ہمارا ماضی اسلامی تعلیمات کی
دھندلی اور نامکمل روشنی کے باوجود دوسری اقوام کے مقابلے میں نہایت
درخشاں رہا ہے، اور اس دنیا کے سامنے سیاست اور آزادی کا نیا باب
کھول دیا ہے۔ لیکن نظام اسلامی اپنی اجتماعی شکل میں خلافت راشدہ کے بعد
خود اپنی ہی قوم کی ملوکیت پسندی کی وجہ سے قائم نہ رہ سکا۔ اس انحطاط کے
اسباب اس قدر واضح اور ظاہر ہیں۔ کہ اس سے اس نظام کی کمزوری ثابت
ہوتی ہے نہ یہ اس کی ناقابلیت عمل پر دلالت کرتا ہے افراد کی نااہلیت کی بنا
پر کسی نظام کا دیر تک نہ چلنا اس کے خلاف دلیل نہیں بن سکتا۔ بلکہ اس
کے حسن و قبح کو معلوم کرنے کے لئے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ جس زمانے
تک وہ رائج رہا، اس نے سوسائٹی پر کیا اثرات مرتب کئے۔

اب سے تیرہ سو برس قبل انسان اس بارِ گراں کا متحمل نہ ہو سکتا تھا۔ جو اس
نظام سے وابستہ ہیں۔ مگر انسان اس وقت نہ اتنا آزاد تھا اور نہ مسلم عوام کی
ذہنی تربیت کی تکمیل ہو سکتی تھی، اس لئے جب تک وہ ان افراد کے ہاتھوں
میں رہا۔ جو اس کی رُوح اور اس کی عملی حیثیت سے واقف تھے وہ کامیابی
کے ساتھ چلتا رہا۔ لیکن جیسے ہی وہ لوگ میدان عمل میں آئے جن کا مقصود
حصول طاقت اور قیام سلطنت تھا مسلمان اس کے فوائد سے محروم ہو گئے
ایسا ہونا بالکل لازمی اور فطری امر تھا۔ لیکن اب جبکہ انسان قدامت پرستی

اور تقلید کورانہ کی زنجیریں توڑ چکا ہے جن کے توڑنے میں اسلام کا بڑا حصہ ہے اور جب وہ ایک صحیح دستورِ حیات اور آئین سیاست و معیشت کی تلاش میں ہے وہ نظام پھر اپنی طرف دعوت انقلاب کے ساتھ دنیا کو اپنی طرف متوجہ کر رہا ہے۔ آج انسان اپنی تمام ترقیوں کے باوجود کسی ایسے نظام کے قیام سے قاصر ہے جو اس کو اس کرّہ زمین پر امن و سکون عطا کر سکے اور خواجگی اور غلامی کی نئی شکلوں سے نجات دلائے، اس لئے اس سے بہتر وقت قیام اسلام کے لئے کون ہو سکتا ہے؟ بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے نام نہاد "اسلامی" ممالک اور ہماری مسلم حکومتیں ابھی تک ملوکیت اور شہنشاہیت کی شکار ہیں۔ تمام دنیا شخصی حکومت کو خیرباد کہہ کر جمہوری نظام کی طرف آ چکی ہے لیکن اسلامی حکمران سیاست کے ان معمولی اور ابتدائی نظریات کو قبول کرنے پر بھی آمادہ نہیں ہیں۔ جن سے مغربی دنیا اپنی تمام خرابیوں کے باوجود آشنا ہو چکی ہے اور جن کو عملی جامہ پہنا چکی ہے۔ ترکی نے جمہوریت کی طرف ایک قدم بڑھایا۔ لیکن اس کا رُخ اسلام کے بجائے مغربیت کی طرف ہے، اس لئے وہاں بھی اسلامی نظام کی امید نظر نہیں آتی۔

اس وقت پاکستان ہی وہ ملک ہے جہاں کے مسلمان اسلامی آئین و نظام کے قیام کے دل سے متمنی اور خواہاں ہیں۔ ان کی پوری تحریک حصول پاکستان اسی ایک نظریے پر مبنی رہی ہے۔ جس وقت وہ مصائب اور آلام کے ایک بے پناہ سیلاب سے گذر رہے تھے جس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔

ان کے سامنے صرف ایک ہی تسلی بخش تصور تھا یعنی احیاء اسلام۔ بدقسمتی سے عہدِ قدیم سے لے کر اب تک نام نہاد دینی حکومتوں کا ماضی اس قدر تاریک اور قابلِ مذمت رہا ہے کہ آجکل کسی مذہبی حکومت کے قیام کا اعلان ہی تمام دنیا کو حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ بنی اسرائیل کے عہد سے لے کر ستر صویں صدی عیسوی تک یعنی پانچہزار برس تک انبیا کرام اور ان کے چند جانشینوں کی زندگیوں کے زمانے کو مستثنا کر کے مصر و ہندوستان، روم و یونان اور عرب و عجم میں یکساں طور سے یہ دینی حکومتیں مذہبی ملوکیت و استبداد کی بدترین شکل میں عوام کے اوپر مسلط رہی ہیں جو رواداری اور مساوات کے نام تک سے آشنا نہ تھیں۔ احبار و رہبان ملوک و سلاطین سے زیادہ عوام پر مظالم ڈھاتے رہے ہیں۔ یہ علما سولہویں خانقاہوں میں مذہبی بادشاہ بن کر اپنے معتقدین و مریدین سے اپنی پرستش کرانے کے سوا کبھی کوئی خدمت عوام کی نہ کر سکے۔ اختلافِ عقائد کی بنا پر جرمِ ارتداد میں لاکھوں انسانوں کو زندہ آگ میں جلانے اور سولی پر چڑھانے اور قتل کرنے کے واقعات سے تاریخ کے صفحات پر ہیں۔ قدامت پرستی اور تقلید کورانہ پر مذہب کی بنیاد رکھنے والے علما نے تحقیق علم و حکمت کو بدعت سے تعبیر کر کے محققین و حکما کے قتل کو روا رکھا۔ ان کے نزدیک محققین کا یہ نیا قدم مذہب سے بغاوت اور خدا سے جنگ کے ہم معنی تھا۔ اور اس کا مرتکب واجب القتل۔

قدیم علما اسلام نے بھی اپنے ہی ہم مذہبوں پر ظلم کرنے میں کوئی کمی نہیں کی۔ معمولی اور جزوی اختلافات کی بنا پر لاکھوں انسانوں کو موت کے گھاٹ

اتارنے کو یہ لوگ اپنی نجات اخروی کا باعث سمجھتے رہے ہیں۔ غیر ضروری اور سطحی اختلاف آراء کی بنا پر فرقہ بندیاں قائم کرنا ان کا دلچسپ مشغلہ رہا ہے تقلید کورانہ کی بنا پر بے شمار مکاتیب خیال قائم کر کے مخالفین پر کفر سازی اور دشنام طرازی کی جو رسم انہوں نے قائم کی وہ آج تک عام انسانوں کے لئے ایک مستقل خطرہ بنی ہوئی ہے، پھر فقہ اور فلسفے کے اختلافات کی بنا پر گروہ بندیاں بنا کر جس طرح انہوں نے پوری حکومت اور سیاست کو باہمی رزم آرائیوں اور قتل و خون کا شکار بنایا ہے۔ اس سے دنیا آج بھی پناہ مانگتی ہے۔ شافعیوں، حنبلیوں شیعوں اور سنیوں، معتزلیوں اور اشعریوں کے باہمی اختلافات کی وجہ سے مسلمان جس طرح باہم دست و گریباں رہے ہیں اور اس طرح باہمی قتل و خون کے جو واقعات رونما ہوتے ہیں۔ وہ سب کو معلوم ہیں۔ علم و حکمت و تحقیق کے خلاف جس طور سے صف بندیاں کی گئیں اور انسانوں کو قدیم یونانی اور عجمی خیالات کا اسیر بنا کر جس طرح اجتہاد و تحقیق کے دروازے انہوں نے بند کئے ہیں ان کے اعادے کی ضرورت نہیں!

مغربی متکلمین جن کی ساری عمارت ہی اس قسم کے مذاہب سے بیزاری اور بغاوت پر قائم ہے۔ اس عہد میں کسی مذہبی حکومت کے تخیل تک سے لرزاٹھتے ہیں ان کا خیال ہے اور جو بڑی حد تک صحیح خیال ہے کہ موجودہ علم و حکمت کی ترقیاں ممکن نہ تھیں اگر قدامت پرست علماء کا اقتدار ختم نہ کر دیا گیا ہوتا۔ اس لئے ہر وہ قدر جو علماء مذاہب کے اقتدار کو واپس لانے میں مدد کرے۔ ان کے نزدیک رجعت پسند

تنگ نظری پر مبنی ہے۔ اس پر ستم ظریفی یہ ہے کہ آج بھی جو علمائے اسلام پاکستان میں حکومت کی بنیاد مذہب پر رکھنا چاہتے ہیں۔ دنیا کی عملی سیاست سے بیگانہ، جدید علوم اور سائنس سے بے بہرہ، جدید اقتصادیات اور بین الاقوامی معاشی مسائل سے یکسر ناواقف ہیں۔ انکی زندگیاں ان کا قدامت پسند اور تنگ نظر طرز عمل مخالفین کے ساتھ ان کا تحکمانہ اور غیر مصالحانہ انداز، شرعی قوانین کے نفاذ کا وہی محدود اور انسانیت کش نظریات آج بھی مذہبی نظام کے نام سے عام افراد کو دور رکھنے کے لئے کافی ہیں۔ اس گروہ میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو خانقاہوں میں سجادہ نشینی کی گدی پر نسلاً بعد نسلاً اسی طور سے مسلط ہیں۔ جس طرح نظام ملوکیت میں باپ کے بعد بیٹا ولی عہد ہوتا ہے۔ ان کے سامنے مریدین اور اندھی تقلید کرنے والے معتقدین کی جماعتیں گردن جھکائے دست بستہ قدمبوسی کے لئے حاضر رہتی ہیں۔ خانقاہوں کے نام وقف کی ہوئی جاگیروں پر ان کا ذاتی تصرف صدیوں سے چلا آتا ہے۔ ان تمام غیر اسلامی حرکات کے باوجود جب وہ شرعی نظام کا مطالبہ کرتے ہیں تو ان کا طرز عمل کسی قدر مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے؟ ان کو اس کا مطلق خیال نہیں کہ کسی صحیح نظام اسلامی میں ان کے طبقے کی کوئی گنجائش نہیں اور اسلام کی سب سے پہلی زد انہی کے اداروں پر پڑتی ہے فی الحقیقت یہ لوگ اسلام کے نام کو عوام کی ذہنیت کو اپنی طرف مرکوز رکھنے اور قیادت اپنے گروہ میں محفوظ کرنے کیلئے استعمال کرتے ہیں۔ ورنہ ان کے طرز عمل طریق فکر اور زاویہ نظر سے اسلامی نظام کو دور کا واسطہ بھی نہیں۔ ان کے مطالبات کی تفصیلات پر اگر غور کیا جائے اور ان کے اعلانات کا اگر تجزیہ کیا جائے تو ان کا محدود اور تنگ نظر تخیل اسلام

بہت جلد واضح ہو جاتا ہے وہ صرف اس قدر چاہتے ہیں کہ اسلام کے فوجداری اور دیوانی قوانین کو فوراً رائج کر دیا جائے خواہ سیاسیات اور معاشیات کا نظام کچھ بھی ہو۔ ترک صوم و صلوٰۃ پر دروں کی سزائیں عام کر دی جائیں۔ مسلمان ایک خاص قسم کا لباس اور وضع اختیار کر لیں۔ عورتیں اگر باہر نکلیں تو ان کو گرفتار کر کے جیل میں بند کر دیا جائے دفاتر میں جمعہ کی تعطیل کر دی جائے۔ عدالتوں کے فیصلے ججوں کے بجائے قاضی کرنے لگیں ان کے مطالبات زیادہ تر عوام کی انفرادی اور نجی زندگی سے متعلق ہیں اسٹیٹ اور افراد کے تعلقات باہمی کیا ہوں اور اسٹیٹ کو افراد کے نجی معاملات میں دخل دینے کا حق اسلام کے نزدیک کہاں تک ہے اس کے معلوم کرنے کی ان کو ضرورت ہی نہیں محسوس ہوتی وہ ان فرائض کو بھی جن کی ادائیگی ترغیب اور اصلاح ذہنیت پر مبنی رکھی گئی ہے قوانین کے ذریعے ادا کرانا چاہتے ہیں۔

بدقسمتی یہ ہے کہ پاکستانی حکومت کے ارباب حل و عقد ایک طرف آئے دن اعلان کرتے رہتے ہیں کہ وہ اسلامی عدل و مساوات پر آئین کی بنیاد رکھنا چاہتے ہیں لیکن وہ اصول کیا ہیں جن سے وہ طبقاتی جنگ کو بند کرنا اور مساوات کو رائج کرنا چاہتے ہیں اسکی تحقیق کی طرف وہ توجہ تک نہیں کرتے۔ دراصل وہ بھی علماء قدیم کے مطالبات سے گھبرا کر اور یہ سمجھ کر کہ واقعی مذہبی حکومت کا نقشہ وہی ہے جو علمائے اسلام پیش کرتے ہیں جسکی زد میں وہ سب سے پہلے آتے ہیں اسلامی نظام کی صرف ان دفعات کے نفاذ کا اعلان کرتے رہتے ہیں جو تمام دنیا میں رائج ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ عوام حکومت سے بیزار اور ان لوگوں کے پیرو ہوتے جاتے ہیں جو اسلامی قوانین کے نفاذ کے اپنے غلط نقطہ نظر سے حامی ہیں یہ راستہ نہایت خطرناک اور مضر ہے۔ اگر خدا

نخواستہ حکومت پر ان لوگوں کا قبضہ ہو گیا تو جس قسم کے شرعی قوانین اب سے چار صدی قبل تک نافذ تھے یا اب افغانستان اور عرب میں نافذ ہیں ان کو نافذ کر کے یہ لوگ اسلام کے تخریب کی بنیاد رکھیں گے اور دنیا اسلام سے اور دور ہو جائیگی

اسلام کسی ایسے قوانین کا نام نہیں ہے جو فرانس امریکہ یا روس کے آئینوں کی طرح محض کسی نمائندہ یا قانون ساز اسمبلی کے نافذ کرنے سے بروئے کار آ سکے اس کے لیے ایک خاص سرزمین اور ماحول پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ جو اتنا مشکل نہیں جیسا کہ بادی النظر میں معلوم ہوتا ہے۔ نہ اس کا یہ مطلب ہے کہ پہلے ان برگزیدہ اور فرشتہ خصائل انسانوں کی جماعت کی تخلیق عمل میں لائی جائے جو اس نظام کو چلا سکے پھر آئین کا نفاذ ہو اگر ایسی جماعت کی تشکیل ویسے ہی عمل میں آ سکتی ہے تو پھر کسی آئین کے نفاذ کی ضرورت ہی کیا ہے؟ یہ نظام تو ایسی سوسائٹی کی تشکیل کا ضامن اور معاون ہو گا جس میں نہ کوئی طبقاتی جنگ ہو نہ مزدور اور عوام کا استحصال بالجبر لیکن اسلام کے سیاسی اور معاشی نظام کو نافذ کیے بغیر صرف شرعی حدود کا جاری کر دینا نامناسب اور اسلام کی اسپرٹ کے خلاف ہے مثلاً جب تک دولت کی تقسیم کا صحیح نظام قائم نہ ہو اور عوام کی عام ضروریات کی اسٹیٹ کفیل نہ ہو جائے تاکہ ان تمام اسباب کا سدباب نہ ہو جائے جو چوری کرنے کے محرک ہیں اس وقت تک چوری کے جرم میں ہاتھ کاٹنے کی سزا کا نفاذ ظلم ہو گا اس لیے شرعی قوانین فوجداری کے نفاذ سے قبل موجودہ اقتصادی نظام کو درہم برہم کر کے اسلام کا معاشی نظام قائم کرنا ازبس ضروری ہے دولت کی غلط تقسیم اور سرمایہ کا غلط مصرف بیشتر جرائم اور بداخلاقیوں کا سبب ہے موجودہ بینکنگ سسٹم کو جس کی بنیاد سودی لین دین پر ہے۔ اسلامی معاشیات کی روشنی میں بالکل نئے سرے سے ڈھالنا ہو گا۔ جاگیرداری کاشتکاری زمینداری کے موجودہ نظام

قدیم شہنشاہیت کی یادگار اور عوام کے افلاس و فلوک الحالی کا سبب ہیں اس میں بڑی تبدیلی کرنی ہے۔ سرمایہ پر زکوٰۃ کی شکل میں محصول عاید کرنا اور قومی بیت المال کا قیام اسلامی پروگرام کے اہم اجزا ہیں جن کے قائم کئے بغیر اسلامی نظام کی طرف کوئی قدم اٹھانا متعذر ہوگا۔ اسلئے پاکستان کے ارباب حل و عقد کا فرض ہے کہ وہ فوراً نمائندہ اسمبلی کی طرف سے آئندہ آئین کے دیباچے (PREAMBLE) میں غیر مبہم اور واضح الفاظ میں اعلان کردیں کہ پاکستان کا آئین اسلامی تعلیمات اور اسلامی پروگرام پر مبنی ہوگا۔ ساتھ ہی ماہرین اقتصادیات و قوانین اسلامی کی ایک کمیٹی کا تقرر بہت جلد لازم ہے جو اسلامی آئین کی ہر تفصیل کا مطالعہ کرکے اور موجودہ حالات کی روشنی میں اسلامی دستور کی سفارش کرے اس کے ساتھ ایک ماہرین تعلیم کی کمیٹی کا تقرر ضروری ہے جو ایک ایسا تعلیمی دستور مرتب کرسکے جس کی اساس اسلامی ہو اور جو آئندہ نسلوں کی ذہنیتوں کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے میں ممد و معاون ہو اس کام کیلئے اور مسلمانوں کی عام اخلاقی حالت بہتر بنانے اور ان کو اسلامی نظام کے بارگراں کا متحمل کرنے کے لئے حکومت کو اپنے تمام وسائل و ذرائع استعمال کرنے ہونگے جو حکومت ایک اخلاقی اور مذہبی نظام رائج کرنا چاہتی ہے اس کے پروپیگنڈے کی مشین دوسری حکومتوں سے بالکل مختلف ہوگی اس کے نشر و اشاعت کے تمام مراکز کا صرف ایک نصب العین ہوگا۔ یعنی مسلمانوں میں سیرت و کردار اور ان صفات کی تخلیق و تشکیل جو اسلامی نظام کے چلانے کے لئے ضروری ہیں۔ عاملین اور متوکلین کی بے غرض اور بے لوث افراد پر مشتمل ایسی جماعت کا وجود ضروری ہے جو اس نظام کے پرزے بن سکیں اور اسلامی قوانین کی مشین کو جاری رکھ سکیں یہ وقت اس قسم کی سطحی بحثوں میں الجھنے کا نہیں ہے کہ نظام پہلے جاری ہو یا عوام کی اخلاقی اصلاح پہلے ہو "مے سے ہو ساغر کہ ساغر سے ہو"؟ اس قسم کی لاطائل

اور دوراز کار مسائل میں الجھنے کا نتیجہ عوام کے ذہنی انتشار کا باعث ہوگا۔ اور اصل نصب العین دور ہوتا چلا جائے گا۔

میں جانتا ہوں جماعت کا حشر کیا ہوگا مسائل نظری میں الجھ گیا ہے خطیب ـ اقبال

کسی نظام کے قائم کرنے کیلئے جس فضا اور سرزمین کی ضرورت ہے وہ پاکستان میں بڑی حد تک موجود ہے۔ اسلامی نظام کے قیام کا ہر شخص متمنی ہے جو لوگ اس کے ناقابل عمل ہونیکے مدعی اور اس کے خلاف ہیں وہ اس پروگرام سے قطعی ناواقف ہیں اور ایسے افراد کی تعداد چند انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے جہاں تک عوام کی تربیت کا تعلق ہے جو قیام نظام کے ساتھ وابستہ اور اس نظام کا ایک اہم جزو ہے اس کیلئے کوشش کرنا ضروری ہے لیکن ان دونوں کاموں کی بنیاد ایک ساتھ رکھنی ہوگی۔

یہ امر باعث اطمینان ہے کہ پاکستان کی سیاست کی بنیاد ملوکیت پر نہیں ہے جو اس نظام کی سب سے بڑی دشمن ہے اسکا نظام جمہوری ہوگا جسمیں ہر فرد آزاد ہوگا۔ اپنے نظام حکومت میں برابر کی حیثیت سے حصہ لیگا اس کیساتھ اقتصادی نظام کا قیام سب سے پہلا قدم ہونا چاہیئے اس کے مطالعے اور قیام کے ذرائع پر غور کرنے کے لئے کسی طویل مدت کی ضرورت نہیں ہے اس تیز رفتاری اور زود گامی کے دور میں جبکہ صدیوں کی رفتار برسوں اور برسوں کی چند ایام میں طے ہوتی ہے کسی طویل مہلت کی گنجائش نہیں ہے حکومت کا پہلا قدم یعنی عوام کی تطہیر و تعمیر ذہنیت کے لیے تعلیمی نصاب کا نفاذ اور اسلام کے اقتصادی نظام کا قیام بہت جلد اٹھنا چاہیئے۔ شرعی حدود کا نفاذ اس نظام کا پیش خیمہ نہیں بلکہ لازمی اور ضروری نتیجہ بن سکتا ہے اگر موجودہ حکومت اپنے اندر وہ صلاحیتیں نہیں پاتی اور وہ جرات اور قوت ارادی اسکے ارکان میں مفقود ہے تو بہت جلد آئین کے سیاسی حصے کی ان دفعات کی مرتب کردیں جسکی رو سے ہر بالغ مرد و عورت کو رائے دہندگی کا حق مل سکے اور اس بنا پر نئے انتخابات کے ذریعے نئی نمائندہ اسمبلی کا قیام عمل میں آسکے جو اس آئین کی ترتیب و تدوین کو اپنا سب سے پہلا فریضہ تصور کرے۔

عبدالوحید خاں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ تاریخ افکار و سیاسیاتِ اسلامی

نگاہِ التفاتے بر سرِ بام کہ من با عصرِ خویش اندر ستیزم

اقبالؒ

اسلاف پرستی

جب کوئی قوم عمل سے محروم اور سیاسی حیثیت سے مغلوب و محکوم ہو جاتی ہے تو مستقبل کی تعمیر کے بجائے اسلاف کی روایات پارینہ پر فخر و ناز کرنا اس کے افراد کا شعار بن جاتا ہے۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ دوسری اقوام ترقی کے میدان میں تیز گامی کے ساتھ بڑھی چلی جا رہی ہیں اور وہ ہر لمحہ قعر مذلت میں گرتے جا رہے ہیں تو اپنی بے کسی و بیچارگی پر پردہ ڈالنے کی غرض سے وہ اسلاف کے کارناموں کو دنیا کے سامنے پیش کر کے خود کو تسلی دے لیتے ہیں لیکن وہ خود کیا ہیں اور مستقبل کی تعمیر میں ان کا کیا نصب العین ہے اس سے ان کو کچھ واسطہ نہیں ہوتا۔

گذشتہ کئی صدیوں سے مسلمان اسی راہ پہ گامزن ہیں۔ آج نہ صرف وہ اپنی ملی و اجتماعی حیثیت کو گم کر چکے ہیں بلکہ معاشرتی۔ اقتصادی اور تمدنی حالت میں بھی ان اقوام کے متبع ہیں جن کی امامت و رہنمائی وہ عرصہ تک کر چکے ہیں اس لئے جب کبھی ان اقوام کی ترقی اور اپنے انحطاط کا خیال ان کو پریشان کرتا ہے تو وہ بغداد۔ قرطبہ۔ دہلی اور قسطنطنیہ کی عظمتِ رفتہ کا تصور کر کے خوش ہو لیتے ہیں۔ اسلاف پرستی کا یہ جذبہ مسلمانوں میں اس حد

تک سرایت کرچکا ہے کہ اسلاف کا ہر وہ عمل جس میں شان و شوکت اور سطوت و جبروت کی نمائش ہو ان کا نصب العین بن چکا ہے خواہ اس عمل کی بنیاد کتنی ہی غیر اسلامی تعلیمات پر کیوں نہ ہو یہی وجہ ہے کہ خلافت راشدہ کے بجائے دور عباسی اور عہد عثمانی میں ان کو اسلامی شوکت و سطوت نظر آتی ہے اور اسی لئے اکثر مسلم مورخین نے ابوبکرؓ و عمرؓ کے بجائے ہارون و مامون اور خالد و کرارؓ کے بجائے طغرل و سنجر کو "قومی ہیرو" بنانے کی کوشش کی اور سلاطین سلجوق و غزنی کے عہد حکومت کو "عہد زریں" سے تعبیر کیا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ خلافت راشدہ کے بعد سے "دین" کا اجتماعی تخیل ختم ہو کر ایک نسلی و قومی نظریہ جاری ہو گیا اور مذہب اسلام کو یا تو انفرادی نجات اخروی کا ذریعہ سمجھ لیا گیا اور زمین پر بسنے والے انسانوں کی دنیوی زندگی سے کوئی واسطہ مذہب سے نہ رکھا گیا یا صرف زمین پر غلبہ حاصل کرنے اور کفار پر حکومت کرنے کا نام "اسلام" قرار پا گیا۔ بہر صورت دین و سیاست اور دنیا و آخرت میں کوئی واسطہ باقی نہ رہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام میں رہبانیت و خانقاہیت اور قیصریت و چنگیزیت آہستہ آہستہ داخل ہو گئیں۔ علماء و مشائخ نے رہبران دین کا لباس پہنکر خانقاہوں اور درسگاہوں پر قبضہ جمایا اور سلاطین و ملوک نے امیر و خلیفہ کے اسلامی نام اختیار کر کے مسند سیاست کو سنبھالا اس طرح اسلام کے زندہ جسم (*Organism*) کے دو ٹکڑے کر ڈالے گئے۔ سلاطین نے علماء و صوفیاء کی سرپرستی کی اور عزت و دولت کے تمام دروازے اپنی سلطانی کو ان کے ذریعے محفوظ رکھنے کے لئے ان پر کھول ڈالے اس کے بدلے میں اس جماعت نے بھی "سلطنت" کے بقا و استحکام کی کوشش میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی نظام سلطنت کو صرف جائز ہی نہیں قرار دیا گیا بلکہ خلافت و سلطنت کے تمام امتیازات کو ختم کر کے سلطنت کی

تمام غیر اسلامی رسومات کو حریم خلافت میں داخل کرنے میں ملوک کی پوری ہمنوائی کی گئی۔ صرف یہی نہیں بلکہ خلافت وسلطنت کے متوازی نظام کے جواز کی ہر امکانی کوشش کی گئی یہاں تک کہ سلطان کو "ظل اللہ" بنا کر " من اطاع السلطان فقد اطاع الرحمن[1] " کے فتاوے بھی دیدیئے گئے اس باطل نظام ملوکیت کی اطاعت کو اس حد تک واجب قرار دیا گیا کہ بسا اوقات علماء و مجاہدین حق کو جلاد کی تلوار سے زیادہ فقہا کے فتووں کی وجہ سے آلام و مصائب میں مبتلا ہونا پڑا۔ ملوکیت و مشیخت کے اس اتحاد کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی زبانیں بند ہوگئیں ان کی حریت رائے اور جرأت اخلاق ختم ہو گئے۔ تنقید و حق گوئی کا جذبہ تک ان سے جاتا رہا۔ قیصر و کسریٰ کی حکومت کا پورا نظام جس کے بت کو توڑنا اسلام کا ایک بڑا مقصد تھا۔ اب مسلمانوں میں آہستہ آہستہ داخل ہوگیا اور ان علماء نے نہ صرف اس سے چشم پوشی کی بلکہ یہ سب کچھ ان کی سرپرستی میں ہوا۔

فقدان جرأت و بیباکی کے اس عہد میں مورخین کی شکایت عبث ہے وہ اکثر اپنے وقت کے مخلوق ہوتے ہیں نہ کہ خالق۔ انہوں نے اگر پورے نظام غیر اسلامی پر پردہ ڈالنے اور ان سلاطین و مشائخ کی مدح سرائی کو ضروری سمجھا تو ان کا ایسا کرنا اس ماحول کا فطری نتیجہ تھا۔ ابتک مسلمانوں کی جتنی تاریخیں مرتب کی گئی ہیں ان کا محض ایک مقصد ہوتا تھا۔ کہ کسی طرح دوسری اقوام کے مقابلہ میں مسلمان حکمرانوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جائے۔ خواہ ان کے تمام غیر اسلامی اعمال کی ذمہ داری اسلام پر کیوں نہ آئے۔ مگر ان کے " قومی ہیرو " دوسری قوم کے سامنے بری الذمہ رہیں اور اس طرح ان کا قومی تفوق قایم رہے۔ تعلیمات اسلامی کے بجائے قومیت و نسلیت کو معیار بنا کر ان مورخین نے مسلمانوں کی ذہنیت کی تخریب

[1] یہ الفاظ محمد تغلق کے سکوں کے ایک طرف منقوش تھے۔

میں جو کام کیا ہے وہ یقیناً قابلِ افسوس ہے ۔ بیشک دوسری اقوام کی نظروں میں ہشام سلیم، اور رماموں کی پوزیشن کو انہوں نے بہت بلند کر دیا اور اسپین۔ ہندوستان و ترکی کے جلیل القدر شہنشاہوں کے لئے یورپ تک سے خراجِ تحسین حاصل کر لیا لیکن انہیں کیا معلوم کہ انہوں نے دنیا کو اسلام کی طرف آنے سے کتنی صدیوں تک کے لئے روک دیا ہے

آج محققین عالم کی نظروں سے اس مفروضہ "عہد زرین" کے افسانوں نے دورِ خلافتِ راشدہ کو بالکل محجوب کر رکھا ہے ۔ دنیا آج حکومت اسلامی کا وہی تخیل تعمیر کر لیتی ہے جس کا نقشہ مورخین اسلام کھینچتے چلے آئے ہیں اور حکومت الٰہیہ کا مکمل اور جامع نظام ان کی نظروں تک نہیں پہنچ سکا ۔

آج جبکہ مسلمان تجدید و احیاء کی ضرورت محسوس کر کے عمارت کی صحیح بنیاد ڈالنا چاہتے ہیں جبکہ ان کی آنکھیں کسی نظام مرکزیت کی تلاش میں لگی ہیں اور مستقبل کی تشکیل اسلامی طرز پر ان کے مدنظر ہے اس کی ضرورت ہے کہ مسلمان بالخصوص مسلم نوجوانوں کے سامنے پوری جرأت کے ساتھ ان کی صحیح تاریخ پیش کر دی جائے اور ان تمام غلطیوں کو آشکار کر دیا جائے جن کی وجہ سے وہ اسلام سے اس قدر دور ہو چکے ہیں ۔ تاکہ انہیں معلوم ہو سکے کہ وہ کونسا مقام ہے جہاں سے انہوں نے اسلام کے بتائے ہوئے راستے کو چھوڑ کر خود ساختہ راہ اختیار کی ہے ۔

سقوطِ خلافت ہمارے جدید قومی مورخین کی نظروں میں مسلم سیاست کا اہم ترین واقعہ سقوط خلافت عثمانی کا اعلان ہے جو ۲۶ رجب ۱۳۴۲ سنہ ہجری دیکم مارچ ۱۹۲۴ سنہ ء) کو مصطفےٰ کمال نے بحیثیت صدر انگورہ ری پبلک کے جاری کیا ۔ اس کے تیسرے روز گرانڈ نیشنل اسمبلی نے اس اعلان پر مہر تصدیق ثبت کی اور

منگل کے روز صبح دو بجے خلیفہ عثمانی نے آخری بار اپنے تخت خلافت پر بیٹھ کر اپنے عزل و جلاوطنی کے اعلان کو سنا اور ایک گھنٹہ کے اندر حکم عالیہ کی تعمیل میں حدودِ حکومت عثمانی سے باہر جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ اس طرح خلافت کا وہ پر شوکت ادارہ جس کی ہیبت تقریباً تیرہ سو برس سے تمام دنیا پر چھا چکی تھی اور جو تقریباً گذشتہ چار صدیوں سے آلِ عثمان کے ساتھ وراثتاً منسوب ہوتا چلا آتا تھا ختم کر دیا گیا۔ یہ تاریخی واقعہ اس لحاظ سے ضرور اہمیت رکھتا ہے کہ مسلمانانِ عالم کی سیاست کا ایک مرکز جو صدیوں سے قائم تھا ختم ہو گیا حجاز۔ عراق۔ مصر کی خود مختاری سے اس مرکز کی سیاسی اہمیت پہلے ہی ختم ہو چکی تھی۔ خلیفہ عثمانی کا اقتدار اگر قائم رکھا بھی جاتا تب بھی حدود ترکستان سے باہر اس کی کوئی اہمیت باقی نہ تھی مصطفےٰ کمال کے اعلان نے صرف اتنا کیا کہ برائے نام خلافت کے بوسیدہ ادارے پر سقوط کی قانونی مہر ثبت کر دی گئی۔

ان واقعات سے قطع نظر دیکھنا یہ ہے کہ خلافت عثمانی کا ختم ہو جانا اسلامی نقطۂ نظر سے کیا اہمیت رکھتا ہے۔ اس عہد خلافت میں کون سے قوانین اسلامی کا نفاذ تھا اور نظام اسلامی کا کتنا حصہ جاری تھا جو تبدیلیِ حکومت سے متاثر ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ خلافت کا یہ ڈھانچہ جس کی بنیاد بنو امیہ نے رکھی تھی اور جو بنو امیہ اور بنو عباس سے منتقل ہو کر آلِ عثمان میں آیا تھا۔ شہنشاہیت اور آمریت کا دوسرا نام تھا "اسلامی نظام" نہ اس عہد خلافت میں رائج تھا نہ بعد میں قائم ہوا۔ اس لئے خواہ ہمارے مؤرخین سقوطِ خلافت پر کتنا ہی ماتم کیوں نہ کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی سیاست کی تاریخ میں یہ واقعہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

اسلامی حکومت، نظام خلافت اور حکومت الٰہیہ سے کیا مراد ہے؟ خلافت نے

میں جو کام کیا ہے وہ یقیناً قابلِ افسوس ہے۔ بیشک دوسری اقوام کی نظروں میں ہشام سلیم، اور ماموں کی پوزیشن کو انہوں نے بہت بلند کر دیا اور اسپین۔ ہندوستان وغیرہ کی کے جلیل القدر شہنشاہوں کے لئے یورپ تک سے خراجِ تحسین حاصل کر لیا لیکن انہیں کیا معلوم کہ انہوں نے دنیا کو اسلام کی طرف آنے سے کتنی صدیوں تک کے لئے روک دیا ہے آج محققین عالم کی نظروں سے اس مفروضہ "عہدِ زریں" کے افسانوں نے دورِ خلافتِ راشدہ کو بالکل محجوب کر رکھا ہے۔ دنیا آج حکومت اسلامی کا وہی تخیل تعمیر کر لیتی ہے جس کا نقشہ مورخین اسلام کھینچتے چلے آئے ہیں اور حکومت الٰہیہ کا مکمل اور جامع نظام ان کی نظروں تک نہیں پہنچ سکا۔

آج جبکہ مسلمان تجدید و احیاء کی ضرورت محسوس کر کے عمارت کی صحیح بنیاد ڈالنا چاہتے ہیں جبکہ ان کی آنکھیں کسی نظام مرکزیت کی تلاش میں لگی ہیں اور مستقبل کی تشکیل اسلامی طرز پر ان کے مدنظر ہے اس کی ضرورت ہے کہ مسلمان بالخصوص مسلم نوجوانوں کے سامنے پوری جرأت کے ساتھ ان کی صحیح تاریخ پیش کر دی جائے اور ان تمام غلطیوں کو آشکار کر دیا جائے جن کی وجہ سے وہ اسلام سے اس قدر دور ہو چکے ہیں۔ تاکہ انہیں معلوم ہو سکے کہ وہ کونسا مقام ہے جہاں سے انہوں نے اسلام کے بتائے ہوئے راستے کو چھوڑ کر خود ساختہ راہ اختیار کی ہے۔

سقوطِ خلافت

ہمارے جدید قومی مورخین کی نظروں میں مسلم سیاست کا اہم ترین واقعہ سقوط خلافت عثمانی کا اعلان ہے جو ۲۷ رجب ۱۳۴۲ ہجری (یکم مارچ ۱۹۲۴ء) کو مصطفےٰ کمال نے بحیثیت صدر انگورہ ری پبلک کے جاری کیا۔ اس کے تیسرے روز گرانڈ نیشنل اسمبلی نے اس اعلان پر مہر تصدیق ثبت کی اور

منگل کے روز صبح دو بجے خلیفہ عثمانی نے آخری بار اپنے تخت خلافت پر بیٹھ کر اپنے عزل و جلاوطنی کے اعلان کو سنا اور ایک گھنٹہ کے اندر حکم عالیہ کی تعمیل میں حدود حکومت عثمانی سے باہر جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ اس طرح خلافت کا وہ پرشوکت ادارہ جس کی ہیبت تقریباً تیرہ سو برس سے تمام دنیا پر چھا چکی تھی اور جو تقریباً گذشتہ چار صدیوں سے آل عثمان کے ساتھ وراثتاً منسوب ہوتا چلا آتا تھا ختم کر دیا گیا۔ یہ تاریخی واقعہ اس لحاظ سے ضرور اہمیت رکھتا ہے کہ مسلمانانِ عالم کی سیاست کا ایک مرکز جو صدیوں سے قائم تھا ختم ہو گیا حجاز۔ عراق۔ مصر کی خود مختاری سے اس مرکز کی سیاسی اہمیت پہلے ہی ختم ہو چکی تھی۔ خلیفہ عثمانی کا اقتدار اگر قائم رکھا بھی جاتا تب بھی حدود ترکستان سے باہر اس کی کوئی اہمیت باقی نہ تھی مصطفےٰ کمال کے اعلان نے صرف اتنا کیا کہ برائے نام خلافت کے بوسیدہ ادارے پر سقوط کی قانونی مہر ثبت کر دی گئی۔

ان واقعات سے قطع نظر دیکھنا یہ ہے کہ خلافت عثمانی کا ختم ہو جانا اسلامی نقطۂ نظر سے کیا اہمیّت رکھتا ہے۔ اس عہد خلافت میں کون سے قوانین اسلامی کا نفاذ تھا اور نظام اسلامی کا کتنا حصہ جاری تھا جو تبدیلِ حکومت سے متاثر ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ خلافت کا یہ ڈھانچہ جس کی بنیاد بنو امیّہ نے رکھی تھی اور جو بنو امیّہ اور بنو عباس سے منتقل ہو کر آل عثمان میں آیا تھا۔ شہنشاہیت اور آمریت کا دوسرا نام تھا "اسلامی نظام" نہ اس عہد خلافت میں رائج تھا نہ بعد میں قائم ہوا۔ اس لئے خواہ ہمارے مؤرخین سقوطِ خلافت پر کتنا ہی ماتم کیوں نہ کریں حقیقت یہ ہے کہ اسلامی سیاست کی تاریخ میں یہ واقعہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

اسلامی حکومت، نظام خلافت اور حکومت الٰہیہ سے کیا مراد ہے؟ خلافت نے

شہنشاہیت کا لباس کس طرح پہنا؟ اور اسلام پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوئے؟ یہ وہ نازک اور اہم سوالات ہیں جن کے صحیح جوابات حاصل ہوئے بغیر اسلامی سیاست کی تاریخ سمجھ میں نہیں آسکتی۔ اس لئے شہنشاہیت اور سلطنت کے غیر اسلامی اصولوں پر تنقید کرنے سے قبل یہ ضروری ہے کہ اسلام کے نظام حکومت کا ایک مختصر خاکہ پیش کر دیا جائے۔

اسلام کا سیاسی تصور (حکومت الہٰیہ)

مذہب اسلام اور اس کے سیاسی تصورات سے متعلق گزشتہ ایک ہزار برس میں جس قدر علمی سرمایہ جمع ہو گیا ہے اس کا اندازہ و حساب امکان سے باہر ہے۔ اسلام کے معمولی جزئیات و فروعات پر تصانیف کے ناقابلِ شمار انبار کتب خانوں اور درسگاہوں کے زینت بنے ہوئے ہیں لیکن باایں ہمہ نظام اسلامی کی صحیح تصویر نہ صرف غیر مسلموں سے پوشیدہ ہے بلکہ خود مسلمانوں کی ایک بڑی اکثریت دُور ازکار بحثوں اور نظری و سطحی مسائل کی الجھنوں میں پھنس کر اس کے خدوخال سے یکسر ناآشنا ہو چکی ہے

اس جہل و لاعلمی کا بڑا سبب یہ ہے کہ اسلام کی اس انقلاب انگیز تحریک کو سمجھنے کے لئے انبیا علیہم السلام بالخصوص نبی آخر الزماں محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے مکمل حالات زندگی کو مشعل راہ نہیں بنایا گیا۔

مغربی مفکرین کچھ اس لئے کہ وہ مادیات کی تحقیق و تسخیر میں اس قدر منہمک و مستغرق ہیں کہ حیاتِ انسانی کی شبِ تاریک کو سحر کرنے کے ذرائع پر غور کرنے کی ان کو ایک لمحے کی فرصت نہیں اور کچھ بربنائے تعصب اسلامی تحریک کی تہ تک پہنچنے کی کوشش نہ کر سکے اور اگر کچھ قدم بڑھایا بھی تو بانیِ اسلام کی زندگی کے صرف چند پہلو سامنے رکھ کر غلط نتائج اخذ کر لئے۔ انہوں نے اسلام کو جنگ و جدل کرنے اور حکومت دنیاوی حاصل کرنے

کی ایک ایسی ہی تحریک سمجھ لیا جس کے ذریعہ دوسری اقوام اپنی تنظیم کر کے حکومتیں قائم کرتی ہیں۔ خود مسلمانوں نے رسول کریم کے اسوۂ حسنہ سے زیادہ بعض علمائے صوفیہ اور اولیائے کرام کے حالات زندگی سے متاثر ہو کر اسلام کا ایک راہبانہ تخیل قائم کر لیا اور دین اسلام کو صرف چند عقائد کا مجموعہ تصور کر کے اس کو جنت حاصل کرنے کا ایک وسیلہ سمجھ لیا۔

مگر شارع اسلام اور ان کے صحابۂ کرام کے مبارک و مسعود دور اور ان کے اسوۂ حسنہ پر ایک گہری نظر ڈالنے سے اسلام کا ایک ایک خدوخال اس طرح روشن ہو جاتا ہے کہ کسی شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی ان علمبرداران حق کی زندگیوں کے ہر پہلو کو دیکھو اسلام کی مکمل تصویر خود بخود سامنے آتی چلی جائیگی۔

ان ملکوتی صفات انسانوں کی زندگی کی بنیاد لا الٰہ الا اللہ **لا الٰہ الا اللہ** کے باطل شکن اعلان پر قائم تھی جو ہر ماسوی اللہ کے خلاف بغاوت و سرکشی کا پیام تھا ان کی زندگیوں کا ہر لمحہ صرف اطاعتِ الٰہی کے لئے وقف تھا دنیا کی کوئی طاقت اور کوئی حکومت ان کے لئے قابل تسلیم نہ تھی وہ غیر الٰہی حکومت کے کسی آئین سے آشنا تک نہ تھے انہوں نے نہ صرف انسانوں کو پتھر کے بتوں کے سامنے سجدہ ریز ہونے سے روکا بلکہ انسان کی خود ساختہ ہر طاقت کو جو احکام الٰہی سے متصادم ہوتی تھی ختم کر دیا۔

درحقیقت یہی اسلام کا آئین اور معین و مقرر نصب العین ہے انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں صرف خدا کی حکومت اور حاکمیت کو تسلیم کرنے اور کسی دوسری طاقت کی اطاعت نہ کرنے کا نام اسلام ہے۔ اسلام کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ انسان سوائے خدا کے کسی دوسری طاقت کی اطاعت یا عبودیت

نہیں کر سکتا۔ ہر وہ نظام جو اس عقیدہ پر مبنی ہو اور جس کا مقصد خدا کی حکومت کا قائم کرنا ہو وہ سیاسی اصطلاح میں اسلامی نظامِ حکومت یا حکومتِ الٰہیہ کے نام سے موسوم ہے۔ اس حکومت کے آئین کی پہلی دفعہ یہ ہے کہ زمین، ملک اور حکومت اللہ کی ہے۔ لم یکن لہ شریک فی الملک اور سوائے خدا کے کسی کا حکم انسان کے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ ان الحکم الا اللہ جس طرح نظام کائنات کی تخلیق و تنظیم میں بلا شرکتِ غیرے " فاطر السموٰات والارض " کا قانون جاری و ساری ہے اسی طرح اس زمین پر بسنے والے انسانوں میں تمام غیر الٰہی اختیارات اور انسانوں کے خود ساختہ قوانین کو ختم کر کے صرف " حکومت الٰہیہ " کو قائم کرنا ہی اسلام کا واحد مقصد ہے۔

الا لہ الخلق والامر اسی کے لئے خلق اور امر دونوں مخصوص ہیں۔

لا الٰہ الا اللہ کا یہ منشور توحید جو صحیفہ اسلام کا ناممکن التحریف اور نا قابلِ بدل دیباچہ ہے ہر اس حکومت اور طاقت کے خلاف اعلانِ جنگ ہے جو ایک انسان نے دوسرے انسان کو غلام بنانے کے لئے قائم کر رکھی ہے وہ طاقت خواہ سلاطین ملوک کی ہو۔ امراء و حکماء کی ہو۔ خاندانوں اور نسلوں کی ہو۔ علماء۔ صوفیاء و احبار و رہبان کی ہو۔ خواہ جمہوریت و وطنیت کی ہو۔ خواہ خود اپنے نفس کی ہو یہ ہر اس نظام تمدن و معاشرت اور سیاست و معیشت کے خلاف کھلا چیلنج ہے۔ جو انسان نے خدائی قوانین کی منظوری کے خلاف قائم کر رکھے ہیں۔

تمام اطاعتیں اور اختیارات اسی اقتدار اعلیٰ کے ماتحت ہیں۔

لا یشرک فی حکمہٖ احدًا
یقولون ھل لنا من الامر من
شیئٍ ط قل ان الامر کلہ للہ ۱۵۴/۳

وہ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتا
وہ پوچھتے ہیں کہ اختیارات میں ہمارا بھی
کچھ حصہ ہے کہدو کہ اختیارات تو سب
اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔

ایک انسان کا دوسرے انسان کی اطاعت و تعبد اختیار کرنا اسلام کے نزدیک شرف انسانیت کے خلاف ہے۔ اس لئے وہ تمام انسانوں سے پکار کر کہتا ہے کہ اگر تم سرفرازی چاہتے ہو تو تم ان تمام طاقتوں سے بیزاری کا اعلان کر دو بلکہ ان کے خلاف صف آرا ہو جاؤ جو انسانوں نے اپنی مرضی کے مطابق بنا ڈالی ہیں اور صرف خدائے واحد کی اطاعت وفاداری کو اپنا شعار بنالو۔

قل انی امرت ان اعبد اللہ
مخلصًا لہ الدین ہ وامرت
لان اکون اول المسلمین ۳۹/۱۳

کہدو مجھے تو یہی حکم ہوا ہے کہ اللہ کی اطاعت
کروں خالص اسی کی بندگی کروں اور مجھ کو
یہ حکم ہوا ہے کہ سب سے پہلے اللہ کا تابعدار
بنوں۔

نبی آخرالزماں نے ببانگِ دہل اسی فرمان آزادی کا اعلان کیا کہ صرف وہی شخص خدا کے نزدیک مطیع و فرمانبردار سمجھا جائے گا جو تمام اقتدارات و اختیارات سے قطع تعلق کر کے صرف ایک حاکمیت و مطلق العنانی کو تسلیم کرے گا اور اسی دستور العمل کو اپنا نصب العین بنائے گا جسکو دوسرے پیغمبروں کی طرح میں لے کر آیا ہوں۔

والذی نفسی بیدہ لا یومن
احدکم یکون ھواہ تبعا

(نبی صلعم فرماتے ہیں) کہ تم میں سے کوئی شخص
مومن نہیں ہوسکتا ہے جب تک کہ اس

لما جئت لہ | کی خواہشات اس قانون اور اس ہدایت کے تابع نہ ہو جائیں جسے میں لے کر آیا ہوں۔

اسلام نام ہی اس یقین انگیز ایمان پرور اور باطل شکن تحریک کا ہے جس میں انسان اپنی اجتماعی و انفرادی زندگی کے ہر پہلو میں صرف حکومت الٰہیہ کو اپنا نصب العین بنائے اور تمام غیر الٰہی حکومتوں اور حاکمیتوں سے تعلق علیحدہ کرے۔

قل ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العلمین ۞ لا شریک لہ وبذلک امرت وانا اول المسلمین ۱۶۴/۶

کہدو میری نماز۔ میرا حج۔ میرا جینا۔ میرا مرنا سب کچھ اللہ ہی کے لئے ہے جو تمام جہان کا پروردگار ہے۔ مجھ کو اسی بات کا حکم دیا گیا ہے اور میں خدا کے فرمانبرداروں پہلا فرمانبردار ہوں۔

ہر وہ نظام جو قوانین الٰہی سے متصادم ہو خواہ وہ مسلم افراد و اقوام ہی کا بنایا ہوا کیوں نہ ہو۔ نامقبول و مردود ہے۔ اور اس غیر اسلامی نظام کا جزو بننا تو کجا اس سے ادنیٰ تعاون بھی گناہ عظیم ہے اور اس کے خلاف جد و جہد نہ کرنا سب سے بڑا جرم ہے۔

ان الحکم الا للہ امر الا تعبدوا الا ایاہ ذلک الدین القیم ۱۲

حکم سوائے اللہ کے اور کسی کا نہیں۔ اس کا فرمان ہے کہ اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو یہی صحیح دین ہے۔

کسی غیر الٰہی طاقت کو بادشاہ مان کر اس کی اطاعت کرنا (اگر وہ طاقت خدا کے مقرر کردہ قوانین سے متصادم ہو) خدا کی بادشاہت سے کھلی بغاوت ہے۔

لم یکن لہ شریک فی الملک | اس کی بادشاہی میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے

زمانے کا انقلاب بھی عجیب ہے! آج ہر طاقت فرمانروا کو قبلہ بنانے ہر حکومتِ وقت کے
نظام کا متحرک پرزہ بننے اور غیر الٰہی حکومت کی اطاعت کرنے کے باوجود صرف زبان سے
لا الہ الا اللہ کہنے کا نام توحید اور قوانین الٰہیہ واحکام خداوندی کے ساتھ انسان
کے بنائے ہوئے نظام کو شریک کرنیکے باوجود صرف پتھر کے سامنے سر جھکانے کا نام شرک ہوگیا
"لا تشرك به شيا ۲۲ "کو" لا تشرك به حجرا" میں محدود کر دیا گیا۔
لیکن قرآن کریم کا ہر لفظ اس پر شاہد ہے کہ " شرک " خدا کی صفات تکوینی و تخلیقی میں کسی
دوسری طاقت کو شریک کرنے ہی کا نام نہیں ہے بلکہ اس کے قوانین ۔ اس کی محبت ۔ اس
کے مقرر کردہ پروگرام کے مطابق بنی ہوئی حکومت کے مقابلہ میں کسی دنیاوی طاقت کی
اطاعت اطاعت طاغوت وعبادتِ شیطان اور کھلا شرک ہے اور اس اطاعت کو اپنا
شعار بنانے والی جماعت یا قوم ہرگز مومن کہلائے جانیکی مستحق نہیں۔ خواہ اس کے افراد
کتنی ہی ظاہری عبادت کیوں نہ کریں۔

شرک اور غلامی | خدائے تعالیٰ کی ذات وصفات میں کسی دوسری ہستی کو شریک کرنا
قرآنی اصطلاح میں شرک ہے۔

ما سوا اللہ کو سجدہ کرنا اور اس کو معبود بنا لینا یا خالق وقادر تسلیم کر دینا ہی شرک نہیں بلکہ
خدا کی محبت واطاعت اس کی حاکمیت وحکومت اس کے حکم وقانون غرضیکہ اس کی کسی شے
میں بھی کسی دوسرے کو شریک کرنا شرک اور ایمان بالطاغوت ہے۔ لا تشرکو شیئاً۔
کا یہی مفہوم ہے اطاعت امیر، حب والدین، تعظیم استاد و مرشد واسلاف غرضیکہ ہر محبت
تعظیم واطاعت اسی کی اطاعت وخوشنودی کے تابع اور اسی کے حکم ورضا سے مشروط ہے
اس کے علاوہ نہ کوئی حکومت وعدالت قابلِ تسلیم نہ کوئی طاقت لائق تعظیم۔

کا مفصّل نقشہ ابتدائی منازل میں پیش کر دینا مشکل تھا لیکن رفتہ رفتہ قرآنِ مجید نے حاکمیت خداوندی کی تعلیمات کو اس طرح پیش کر دیا کہ کسی شبہ کی گنجائش باقی نہ رہی بلکہ خلافتِ راشدہ کے عہد میں خدا کی حاکمیت کا پورا عملی نقشہ دنیا کے سامنے آگیا۔ لیکن زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ عہدِ جاہلیت کے رجحانات پھر عود کر آئے اور اگرچہ خدا کے خالق کائنات و قادرِ مطلق ہونے پر کوئی شبہ اس عہد میں پیدا نہ ہوا مگر قوانین الہیہ کو تاویلات و تحریفات کے ذریعہ انسانی احکام کے ماتحت کر دیا گیا۔ حکومت کو خاندانی اور شخصی بنا لیا گیا اور حکومت میں مطلق العنانی اور اختیاراتِ اعلیٰ ایک شخص کی ذات میں مذکور ہو گئے۔ جو خدا کے لئے مخصوص تھے۔ جن کی رو سے حاکم یا خلیفہ کی حیثیت محض ایک کارندے یا عامل کی تھی۔ رفتہ رفتہ حاکمیت الہیہ کا تخیل ہی مٹ گیا۔ یہاں تک کہ آگے چل کر جب وحدت الوجود کا فلسفہ تصوّف میں داخل ہوا اور لا موجود الا اللہ کے نظریے کی صوفیا نے تبلیغ اس طرح شروع کی کہ انسانوں اور حیوانوں تک کو خدا سے تعبیر کرنا شروع کر دیا اس وقت بھی لا حاکم الا اللہ کا نظریہ مسلمانوں کی نظروں سے پوشیدہ رہا اور غیر الٰہی قوانین کا نفاذ خود مسلمان بادشاہوں کے ہاتھوں ہوتا رہا اور سلاطین و ملوک کے جاری کردہ احکام کو خدائی قوانین میں شریک ٹھہرانے کے باوجود آج تک مسلمان "شرک" کا لفظ ان لوگوں کے لئے استعمال کرتے رہے ہیں جو اپنی زبان سے غیر مسلم ہونے کا اقرار کرتے ہیں۔

آج جبکہ بت پرستی کا پرانا طریقہ خود مشرکین میں مفقود ہو چکا ہے اور شخصی حکومت کا نظریہ بھی اپنی موت مر رہا ہے شرک، عہدِ جدید کی پیدا کردہ تحریکات کا لباس پہن کر نمودار ہو رہا ہے۔ اب بھی بُت پرستی جاری ہے لیکن اب بت بجائے پتھر کے انسان کے تصورات اور نظریات کے پیدا کردہ ہیں۔ اب جمہوریت، فسطائیت، اشتراکیت

ابتدائی زمانۂ اسلام میں توحید کا یہ ہمہ گیر تخیل مسلمانوں کی زندگی کے ہر پہلو میں نظر آتا ہے اس کی انفرادی و اجتماعی حیات کے ہر شعبے میں صرف خدا کی حکومت (Sovereignty) نظر آتی ہے لیکن خلافت راشدہ کے بعد جب "حکومت الٰہیہ" کی جگہ شخصی و خاندانی حکومت نے لی اور زمین پر خدائی قانون کے بجائے ملوک و سلاطین کے جاری کردہ احکامات کا نفاذ ہوا اور ان غیر اسلامی نظریات کو عام کرنے کی غرض سے جب کتاب اللہ میں تاویلات کے دروازے کھل گئے تو "قوانین الٰہیہ" کے بجائے انسانی احکام کے نفاذ کے ساتھ ساتھ خدا کو صرف زبان سے حاکم مطلق مان لینے کو ایمان کی شرط کامل سمجھ لیا گیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن کریم میں لفظ "شرک" بیشتر مقامات پر صفاتِ خالقیت و ربوبیت میں کسی کو شریک ٹھہرانے کے مواقع پر استعمال کیا گیا ہے۔ ظہور اسلام کے وقت بت پرستی کا عام رواج تھا۔ کامیابی حاصل کرنے مضرت سے بچنے کے لئے بتوں سے دعائیں مانگی جاتی تھیں۔ پانی برسانے۔ زراعت میں برکت حاصل کرنے بیماریوں کو دفع کرنے دھوپ نکالنے اور اس قسم کی بیشمار صفات سے وہ بت متصف سمجھے جاتے تھے۔ اگرچہ زمین و آسمان کے خالق کی حیثیت سے ایک ایسی ہستی کا تخیل عام طور سے موجود تھا۔ جو ان بتوں سے بلند ہو۔ بالعموم اصنام کو خدا کا سفارشی سمجھا جاتا تھا۔ لیکن خدا کا صحیح تصور موجود نہ تھا اس لئے اس وقت صفات سے زیادہ خدا کی ذات کا غیر مبہم اور واضح تخیل پیش کرنا اور اس کی وحدانیت کا ثابت کرنا بیحد ضروری تھا۔ اس وقت تو یہ بتانا ضروری تھا کہ خدا کے علاوہ نہ کوئی ذات نفع پہنچا سکتی ہے نہ نقصان۔ اطاعت و عبادت صرف اسی اعلیٰ ہستی کی کی جا سکتی ہے۔ اس لئے اگر اسوقت لفظ "الہ" کا مطلب اکثر قادر، خالق و رزاق سمجھا جاتا تھا۔ تو کوئی تعجب کی بات نہیں، مشرکین عرب کے سامنے قوانین و احکاماتِ خداوندی اور حکومتِ الٰہیہ

اور قومیت کے بُت نئی شکلوں میں نمودار ہو رہے ہیں جن میں خدا کا مقرر کردہ پروگرام اور اس کا بنایا ہوا نظام انسان کے ایجاد کردہ قوانین کے ماتحت کر دیا گیا ہے اور ایک انسان کے بجائے بہت سے افراد نے ملکر خدائی حقوق قانون سازی کو اپنا لیا ہے۔ یہ شرک کی نئی شکل ہے۔ اس لئے اس وقت بہت صاف اور واضح طور سے اس حقیقت کے انکشاف کی ضرورت ہے کہ زبان سے خدائے قادر حاکم مطلق اور خالق ارض و سما تسلیم کر لینا کافی نہیں ہے بلکہ زمین پر حکومت کرنے کا حق صرف خدا ہی کو ہے انسان کو قانون بنانے کا کوئی حق نہیں۔ قانون صرف وہی قابلِ تسلیم ہے جس پر خدائی مہرِ تصدیق ثبت ہے۔ ہر وہ شخص جو غیر الٰہی قانون کی اطاعت بہ تسلیم و رضا کرتا ہے شرک کا ارتکاب کرتا ہے چنانچہ قرآن کریم غیر الٰہی قانون سے فیصلہ کرانے کو اس طرح منافیِ ایمان قرار دیتا ہے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُوا بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ مِن قَبْلِكَ يُرِيدُونَ أَن يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَن يَكْفُرُوا بِهِ ؕ

اے پیغمبر! کیا تم نے ان لوگوں کی حالت پر نظر نہیں کی جن کا دعویٰ یہ ہے کہ جو کچھ تم پر نازل ہوا ہے اور جو کچھ تم سے پہلے نازل ہو چکا ہے وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں، لیکن (عمل کا یہ حال ہے کہ) چاہتے ہیں اپنے جھگڑے طاغوت (سرکش انسان جو خدا سے باغی ہو) سے کرائیں حالانکہ انہیں حکم دیا جا چکا کہ اس سے انکار کریں۔

آیت مذکورہ میں کسی غیر الٰہی عدالت کے تسلیم کرنے کو نا جائز ہی نہیں کہا گیا بلکہ ایسا کرنے کو ایمان کے خلاف بتا دیا گیا ہے۔ درحقیقت اسلام کے نزدیک ایک انسان یا

گروہ کا کسی دوسرے انسان یا گروہ کی غلامی اختیار کرنا خدا کی بندگی میں دوسرے کو شریک کرنے کے مرادف ہے۔ اس لئے اسلام میں شرک اور غلامی لازم و ملزوم ہیں ہر غلام فرد یا جماعت شرک کی مرتکب ہے۔

یہاں اس حقیقت کی توضیح ضروری ہے کہ اسلام کے نزدیک "غلامی" اور "آزادی" کا تخیل موجودہ نظریات سے مختلف ہے۔ آجکل ایک قوم کے دوسری قوم پر تسلّط و تغلب کا نام "غلامی" اور اس سے نجات حاصل کرنے کا نام "آزادی" ہے۔

اس تعریف کے مطابق ہندوستان اور فلسطین کے باشندے غلام ہیں۔ مگر امریکہ یا انگلستان، ترکی، و افغانستان کے باشندے "آزاد" ہیں۔ اسلام اس کو تسلیم نہیں کرتا اسلام کے نزدیک کسی انسان یا قوم کی خودساختہ حکومت و اقتدار کے سامنے دوسرے انسانوں کا سر تسلیم خم کرنا غلامی کی بدترین شکل ہے خواہ حکومت اپنی قوم ہی کے افراد کے ہاتھوں میں کیوں نہ ہو اور ہر نظام ماسوا سے بغاوت اور محض قانون الٰہی کی اطاعت کا نام "آزادی" ہے

انگلستان۔ امریکہ و فرانس کے باشندے جو نہ صرف قومی حیثیت سے خودمختار ہیں بلکہ دوسری اقوام کی ثروت و دولت کو بھی خود ہضم کر چکے ہیں۔ کیا حقیقی معنوں میں آزاد ہیں؟ کیا وہاں ایک طبقہ دوسرے طبقے کو اپنے مفاد کے لئے استعمال (Exploit) نہیں کر رہا ہے؟ کیا وہاں منتخب شدہ سرمایہ داروں کی مٹھی بھر جماعت دوسرے انسانوں پر حکمرانی نہیں کر رہی ہے؟ یہی وہ نظام ہے جس میں انسان دوسروں پر حکومت کرنے اور بے حد و بے شمار مال و دولت کا مالک ہونے کے باوجود غلام رہتا ہے۔ اس مہلک نظام میں ایک قوم کے افراد کسی دوسری قوم کے غلام ہونے کے

بجائے خود اپنے ہی حکمرانوں کے غلام ہوتے ہیں۔ اس نظام میں ایک انسان کے دوسرے انسان پر تسلط و تغلب کی مصیبت اس لئے اور بھی زیادہ تکلیف دہ ہے کہ دوسری قوم کی غلامی میں احساس غلامی باقی رہتا ہے لیکن اس نظام میں خود اسی قوم کے افراد اس مشین کے پرزے ہوتے ہیں اور اپنی آزادی کو ختم کرنے میں خود آلہ کار بنتے ہیں

ع صید خود صیاد را گوید بگیر

حاکم حقیقی سے بغاوت کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ آج مغرب ملک و قوم اور رنگ نسب کے بتوں کی پرستش میں مصروف ہے وہاں کے ہر فرد پر وطن کی غلامی اور قوم کی عبودیت فرض ہے اور یہی عبودیت ماسوا مغرب کی تباہی کا سبب بن چکی ہے اس لئے تمام مغربی اقوام آج ہلاکت کے بے پناہ سیلاب میں غرق ہیں جس سے ان کو نجات ملنا ناممکن نظر آتا ہے ؎

خبر ملی ہے خدایانِ بحر و بر سے مجھے فرنگ رہگزر سیل بے پناہ میں ہے

مغرب کی مثالوں کو نظر انداز کرتے ہوئے خود مسلمانوں کی حکومت بنو امیہ، بنو عباسیہ کے عہد سطوت و جبروت کا تصور کیجئے جبکہ ان کا حکمران خلیفہ کہلاتا تھا۔ اور ان کی حکومت کو خلافت کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ مسلمان اس عہد سے زیادہ ثروت و دولت کے مالک کبھی نہیں ہوئے۔ پھر کیا ہارون و مامون کے عہد میں مسلمان یا ان کا مذہب آزاد تھا؟ کیا اس وقت نظام الٰہی کے بجائے انسانوں پر نظام ملوکیت مسلط نہ تھا؟ کیا اس زمانے میں مسلم عوام و علماء حکومت وقت کی نا روا بندشوں میں اسیر ہو کر ان کے غیر اسلامی احکامات کے سامنے نہ جھکتے تھے حالانکہ اسلام نے ہر حکم ماسوا کے سامنے جھکنے کو مردود قرار دیا ہے۔

وہی سجدہ ہے لائق اہتمام   کہ ہو جس سے ہر سجدہ تجھ پہ حرام (اقبال)

پھر کیا ان حکومتوں کو اسلامی حکومت کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے کیونکہ ان کے بادشاہ مسلمان تھے؟ قرآنی فیصلے کی رو سے صرف وہی حکومت اسلامی کہی جا سکتی ہے۔ جہاں قانون الٰہی نافذ ہو۔ جہاں حاکمیت خداوندی عملاً جاری ہو۔ اور انسان سوائے خدا کے ہر قسم کی بندگی و غلامی سے آزاد ہوں جو حکومت اس اصول پر مبنی نہ ہو وہ باوجود مسلمان حکمران کے غیر اسلامی حکومت ہے۔ صرف امیر حکومت کے مسلمان ہونے سے اس حکومت کو اسلامی نہیں کہا جا سکتا کیونکہ اسلام کوئی نسلی یا قومی نظام کا نام نہیں ہے بلکہ اصول و عقائد دنیوی و اُخروی کے مجموعے کا نام ہے۔ پس جو حکومت ان اصول و عقائد کو اپنا نصب العین بنائے گی۔ اسی کی اطاعت و فرمانبرداری مسلمانوں پر لازم ہے۔ اس نظام پر قائم شدہ حکومت کا نام دارالاسلام ہے۔ اس کے علاوہ ہر نظام غیر اسلامی ہے اور ہر ایسی حکومت و قوت کی اطاعت جرم اور اسلام کے نزدیک سب سے بڑا گناہ بلکہ شرک ہے جو ایسے نظام کفر پر مبنی ہو۔ یہی وجہ تھی کہ امام ابوحنیفہ نے رسول کریم کے چچا حضرت عباس کی اولاد کی حکومت تک سے تعاون گوارا نہ کیا چونکہ ان حکومتوں میں اسلام اسی طرح بیگانہ تھا جس طرح غیر مسلم حکومتوں میں اس لئے آپ نے منصور کے اصرار کے باوجود حکومت کا اہم عہدہ قضاۃ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور حکومت کا جزو بننا مناسب نہ سمجھا۔ یہی نہیں بلکہ آپ نے خلیفہ منصور کے مقابلہ میں ابراہیم کی بغاوت کو جہاد سے تعبیر کیا اور خود چار ہزار درہم بھیج کر اس کی امداد کی اور یہاں تک مشورہ دیا کہ "جب آپ دشمنوں فتح پائیں تو وہ برتاؤ کریں جو آپ کے باپ (حضرت علیؓ) نے "صفین" والوں کے ساتھ کیا تھا۔ زخمی اور بھاگ جانے والے سب قتل کئے جائیں۔ اور وہ طریقہ اختیار

نہ کیجئے جو آپ کے والد نے (حربِ جمل) میں جائز رکھا تھا۔ کیونکہ مخالف بڑی جمعیت رکھتا ہے[۱۵]۔

اسی طرح امام مالک نے اسی خلیفہ کے خلاف اس سے قبل نفس ذکیہ کا ساتھ دیا تھا ان دونوں اماموں کے طرزِ عمل سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اگرچہ حکمراں مسلمان تھے۔ مگر وہ ان کی اطاعت کو جائز نہ سمجھتے تھے۔ اس لئے کہ حکومت صحیح معنوں میں اسلامی نہ تھی۔ لیکن افسوس علماء مابعد نے ہر اس حکومت کی اطاعت کو جائز بلکہ بعض نے واجب قرار دیا جس کی بنیاد امن اور رواداری پر قائم ہو اور جو شعائر مذہبی در رسومات و عبادات میں مخل نہ ہو۔ لیکن مذہب سے ان علماء کی جو مراد ہے وہی دراصل ان تمام غلط فہمیوں کی بنیاد ہے۔ یہ تمام فتنے مذہب و سیاست کی تقسیم سے پیدا ہوتے ہیں۔ امورِ دنیوی کو مذہب سے علیحدہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب کا تخیل ان کے نزدیک اس قدر تنگ و کوتاہ ہو گیا کہ انہوں نے بعض عقائد و رسومات و عبادات کو ہی مذہب سمجھ لیا۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ شبلی جیسے مورخ اسلام نے ہارون و مامون کو اپنا ہیرو سمجھا اور سلطان عبد الحمید خاں کی غیر اسلامی شان و شوکت کو دیکھ کر اس پر افسوس کرنے کے بجائے خدا کا شکر ادا کیا اسی لئے آپ نے حضرت عبد الرحمن بن عوف اور چند دوسرے مسلمانوں کے ابی سینیا ہجرت کر جانے اور وہاں ایک جنگ کے موقع پر شاہ نجاشی کی فتح کے لئے غاروں میں دعا مانگنے سے یہ نتیجہ نکالا کہ غیر مسلم حکومت کی اطاعت جائز ہے جیسا کہ ان صحابہ کرام نے روا رکھی تھی۔ افسوس مولانا کی نظر اس حقیقت پر نہ پہنچ سکی کہ کسی غیر مسلم حکومت میں مستقل سکونت اختیار کر کے اس کے نظام کی اعانت و اطاعت کرنا اور اس کی مشین کا پرزہ

۱۵۔ النعمان، از علامہ شبلی ص ۳۷

بن جانا عارضی قیام سے مختلف ہے ایک مسلمان بسلسلۂ تبلیغ حق یا تجارت یا کسی اور کام سے اگر کہیں غیر مسلم حکومت میں قیام کرے تو اس پر زمانۂ قیام تک اس حکومت کی وفاداری اور اس کے قانون کی اطاعت واجب ہوگی بالخصوص جبکہ وہ حکومت اسلام کے خلاف برسرِ پیکار نہ ہو اور پناہ لینے کی صورت میں تو اس سے وفاداری کرنا عین ایمان ہے لیکن کسی غیر اسلامی نظام کا متحرک یا غیر متحرک جزو بننا بالکل مختلف ہے[1]

[1] یہاں فطری طور سے سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو مسلمان غیر مسلم ممالک بالخصوص ہندوستان، چین، برما وغیرہ میں رہتے ہیں ان کا طرز عمل وہاں کی ملکی حکومتوں کے ساتھ کیسا ہونا چاہیے۔ اور ان کی وفاداری ان ممالک کے ساتھ کس قسم کی ہونی چاہیئے؟ ہندوستان کی تقسیم سے پیدا شدہ مخصوص حالات کی بنا پر اس قسم کے مسائل کا سامنے آنا لازمی ہے۔ اس مسئلہ پر غور کرتے وقت چند باتوں کو ذہن نشین کر لینا بہت ضروری ہے جس سے تمام الجھنیں خود بخود دور ہو جائیں گی

(۱) جس جگہ اسلامی نظام رائج نہیں ہے خواہ وہاں کی حکومت قومی اعتبار سے مسلمان کے ہاتھوں میں ہو یا غیر مسلموں کے ہاتھوں میں۔ خواہ وہ افغانستان و ایران کی حکومت ہو یا ہندوستان و پاکستان کی اسلام کے نزدیک سب برابر ہیں کسی ایک کی اطاعت اور دوسری سے بغاوت کا خیال لغو ہے۔ جدید قومی تصورات پر جو حکومت بھی بنی ہو خواہ وہاں قوم کی بنا ملک و وطن پر ہو یا نسل و روایات و تمدن پر وہ سب یکساں ہیں۔

(۲) مسلمان غیر مسلم ممالک میں جہاں کہیں آباد ہیں اس کی دو شکلیں ہیں، یا تو وہ غیر ملکی اور عارضی طور پر مقیم ہیں یا باقاعدہ شہری اور حکومت کے فرد ہیں۔ دونوں صورتوں میں وہاں کی حکومت کی اطاعت و وفاداری ان پر واجب ہے۔ پہلی صورت میں اسلئے

(بقیہ حاشیہ صد ۱۹) کہ وہ بیرونی ہونے کی حیثیت سے دوسری ملکی حکومت میں مداخلت کا حق نہیں رکھتے۔ دوسری صورت میں اس لئے کہ انہوں نے غیر مسلم ملک میں مستقل قیام خواہ رضا مندی سے یا مجبوریوں کی بنا پر اگر اختیار کیا ہے تو یہ سمجھ کر کیا ہے کہ وہاں کی حکومت غیر مسلم ہے اور اس کے آئین و قوانین اس ملک کے بنائے ہوئے ہیں۔ جب تک وہ ملک ان کو شہری حقوق عطا کرتا ہے، اور وہاں ان کو دوسرے افراد کی طرح ترقی اور اس کے تمام مواقع مہیا ہیں ان پر لازم ہے کہ وہ ان تمام فرائض کو ادا کریں جو افراد پر حکومت کے حق میں عاید ہوتے ہیں۔

(۳) حکومت کی وفاداری کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وہ حکومت وقت کے پروگرام اور اس کے نافذ کردہ نظام کو چلانے میں ممد و معاون ہوں۔ ہر جماعت اور فرد کو ایک مہذب حکومت کے اندر رہتے ہوئے اپنے عقائد و خیالات کی اشاعت کا پورا حق حاصل ہے۔ اس لئے مسلمانوں کو ہر جگہ یہ حق حاصل ہے کہ وہ انفرادی طور پر یا اجتماعی طور سے اگر کوئی تعمیری پروگرام ملک کی معاشرت، اقتصادیات یا تمدن سے متعلق پیش کرنا چاہیں تو پیش کریں اور اگر وہ سمجھتے ہیں کہ حکومت کا پروگرام عوام کے لئے مضر ہے تو آئینی طور سے اس کے خلاف مظاہرے کرنے اور مخالفت کرنے کا ان کو حق حاصل ہے۔ ہندوستان میں سوشلسٹ یا کمیونسٹ پارٹی کے افراد اگر حکومت کے عہدے قبول کرنے سے انکار کر سکتے ہیں اور حکومت کے پروگرام کی مخالفت کر سکتے ہیں تو مسلمان بھی حکومت کے غلط نظام کا جزو بننے سے صحیح طور سے انکار کر سکتے ہیں۔

(بیسلسلہ متن ۱۹) مذہب کے اسی غلط تخیل کا نتیجہ تھا کہ نصیر الدین طوسی جیسا محقق عالم ہلاکو خاں کے ظلم و جور کے تمام افعال میں معاون تھا یہاں تک کہ بغداد پر حملہ کرنے کی ترغیب بھی اسی نے دی تھی۔ اسی ہلاکو خاں کا وزیر اعظم ایک مسلمان عالم خواجہ رشید الدین تھا

اور ایک دوسرا مسلمان علاؤالدین اس کا دستِ راست تھا۔

ان سب میں حیرتناک واقعہ علامہ ابن خلدون کا ہے تیمور لنگ نے جب دمشق کو جلایا لوٹ مار کی اور اس کے باشندوں کو ذبح کر دیا اور دربار آراستہ کیا تو ابن خلدون نے تیمور کی خدمت میں ایک بدیع الخط قیمتی جلد کا قرآن مجید، قصیدہ "بردہ" یہ مدح رسول، ایک سجادہ اور مصری حلوے کی دو پٹاریاں ہدیۃً پیش کیں، سلام کیا اور بیٹھ گیا۔ پھر تخت شاہی کی طرف بڑھا اور آگے تحفے پیش کئے۔ تیمور قرآن کی تعظیم کیلئے کھڑا ہوا اور قصیدہ کو بوسہ دیا۔ حلوے کو بادشاہ نے خود چکھ کر دوسروں میں تقسیم کر دیا اور اس کے بعد ابن خلدون کی خواہشات معلوم کر کے پوری کر دیں[۱]

علامہ شبلی نے اپنے اس نظریئے کی تائید میں کہ غیر اسلامی حکومت میں اگر شعائر مذہبی کی اجازت ہو تو اس کو دارالحرب نہیں کہہ سکتے۔ فتاویٰ بزازیہ کی مندرجہ ذیل عبارت نقل کی ہے۔

"باقی وہ مقامات جہاں کے حاکم کافر ہیں تو وہاں بھی جمعہ اور عیدین کا ادا کرنا جائز ہوگا اور قاضی مسلمانوں کی رضا مندی سے ہوگا کیونکہ یہ طے ہو چکا ہے کہ جب تک علت باقی رہتی ہے حکم باقی رہتا ہے اور یہ متفقاً ہم طے کر چکے ہیں کہ یہ مقامات "تاتاریوں کے آنے سے پہلے" دارالاسلام "تھے اور ان کے قابض ہو جانے کے بعد اذان جمعہ اور نماز باجماعت بہ اعلان ہوتی ہے اور فیصلے شریعت کے موافق کئے جاتے ہیں اور درس و تدریس بھی بغیر روک ٹوک جاری ہے تو ایسی حالت میں ان مقامات کو "دارالحرب" کہنے کی کوئی وجہ نہیں ہے"[۲]

---

[۱] ابن خلدون۔ از ڈاکٹر طہٰ حسین مترجمہ از عبدالسلام ندوی صفحہ ۲۱

[۲] مقالات شبلی جلد اوّل صفحہ ۱۷۱

ان چند مثالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان علماء کے نزدیک وجوب اطاعت و لغاوت کا معیار سلسلہ درس و تدریس، مذہبی رسوم کی ادائیگی اور فیصلوں کا شریعت کے مطابق ہوتے رہنا تھا۔ آجکل بھی جتنی تحریکیں "آزادی" کے نام پر اٹھ رہی ہیں ان میں سے اکثر نے اس معیار کو نصب العین بنا رکھا ہے۔ اس ملک (ہند) کی بعض غیر مسلم جماعتیں مسلمانوں کے اسی معیار "آزادی" سے ناواقف ہونے کی وجہ سے ان کی مذہبی اور کلچرل آزادی" کا اعلان کرتی رہتی ہیں۔ ہندوستان میں کمپنی کی حکومت میں جب تک فیصلے مسلم قاضیوں کے قلم سے ہوتے رہے، علماء ہند، اس ملک کو دارالاسلام سے تعبیر کرتے رہے (اگرچہ بعض علمائے حق نے اس کی مخالفت بھی کی) اور آج بھی کفر و اسلام میں اتحاد پیدا کرنے کی وجہ سے" دارالامن "کی ایک نئی اصطلاح بنالی گئی ہے۔ آج بھی ہندوستان کی سرزمین میں علماء کی ایک جماعت اسلام کو آزاد تصور کرتی ہے اور ایک دوسری جماعت کا خیال ہے کہ موجودہ حکومت کے ختم ہونے پر متحدہ و مشترکہ حکومت کا قیام آزادی اسلام کا ضامن ہوگا۔ لہ یہ عبارت قبل تقسیم ہند لکھی گئی تھی

ان سب غلط نتائج کے استخراج کا سبب یہی ہے کہ مذہب کی آزادی سے ان لوگوں کی مراد صرف عبادت گاہوں میں جاکر دو رکعت نماز پڑھ لینا ہے جیسا کہ علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے۔

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

اسی لئے ان کے نزدیک مذہبی عقائد و رسومات کو قائم رکھتے ہوئے کفر و اسلام کے امتزاج سے ایک مشترک نظام کی تخلیق بالکل جائز ہے۔ یہ اسی کفر و اسلام کے مشترک نظام میں زندگی گذارنے کا نتیجہ ہے کہ علماء اسلام کو ہمیشہ ایسے نئے مسائل سے واسطہ

پڑتا رہتا ہے جو اسی نظام کی لازمی پیداوار ہیں اور جن کی عجیب عجیب تاویلات کرنی پڑتی ہیں کہیں وہ بنکنگ ۔ انشورنس اور سود وغیرہ کے نئے طریقوں کے جواز و عدم جواز پر غور کرتے ہیں حالانکہ اس قسم کے مسائل کا پیدا ہونا غیر اسلامی نظام کا نتیجہ ہے کبھی وہ انکم ٹیکس چنگیوں اور نئے نئے محصولات کے حسن و قبح کو سوچتے ہیں اور نہیں جانتے کہ جس بیمار کا تمام جسم ہی سڑ رہا ہو اس کے امراض کا علیحدہ علیحدہ علاج ہونا اسوقت تک ناممکن ہے جب تک ان امراض کی علت باقی ہے ایک مرض کا سدِباب ایسی صورت میں خود بخود دوسری مرض کا سبب بن جاتا ہے جب تک جسم میں مادّہ فاسد موجود ہے ایک حصّہ جسم کا دنبل اگر دب بھی جائے تو کیا فائدہ ؟ اسی طرح کبھی وہ ان مسائل سے دوچار ہوتے ہیں کہ فلاں فلاں معاملات کا فیصلہ غیر مسلم ججوں سے کرانا جائز ہے یا نہیں ؟ ان کے نزدیک غیر اسلامی نظام میں اگر بعض معاملات کے فیصلے مسلم قاضیوں کے ذریعہ ہوجایا کریں تو وہ فیصلے جائز ہوں گے افسوس ان کی نظر اس حقیقت کی طرف نہیں جاتی کہ اسلام ایک نظام ہے جس کی بنیاد شخصیت پر نہیں بلکہ اصول پر ہے جب تک وہ طاقت غیر مسلم ہے جو ان حاکموں کو مقرر کرتی ہے اور وہ عدالتیں غیر مسلم نظام کا جزو ہیں ۔ ان کا کوئی فیصلہ اسلام کے نزدیک قابلِ قبول نہیں ہے ۔ خواہ وہ مسلم ججوں کے قلم سے صادر ہو یا غیر مسلموں کے ہر وہ مسلمان جو نظام غیر اسلامی کا جزو ہے خواہ بزرگی کے لحاظ سے کتنا ہی عظیم المرتبت کیوں نہ ہو اسلام کے نزدیک لائق مذمت ہے اور اس کا کوئی کام جو اس نظام سے متعلق ہے خواہ کتنا ہی مستحسن ہو نامقبول ہے ۔

ہو اگر قوتِ فرعون کی درپردہ مرید
قوم کے حق میں ہے لعنت وہ کلیم الٰہی ! (اقبالؒ)

غیر فطری مسائل کا حل ان غیر فطری مسائل کا جو غیر اسلامی ماحول کا لازمی نتیجہ ہیں حل جسطرح پیش کیا جاتا ہے وہ اسی طرح مضحکہ خیز ہوتا ہے جس طرح درد قولنج میں مارفیا کا انجکشن یا پژمردہ درخت کی جڑ کو چھوڑ کر شاخوں کی آبیاری۔ قرآن کریم اور احادیث میں اس قسم کے مسائل کا ذکر تک نہیں جن میں غیر اسلامی نظام میں زندگی گذارنے کے طریقے بتائے گئے ہوں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ نعوذ باللہ کتاب الٰہی ناقص ہے بلکہ قرآن نے مسلمانوں کے سامنے اس کا کوئی تخیل ہی پیش نہیں کیا کہ وہ کسی ایسے نظام سے وابستہ رہ کر زندگی بسر کر سکیں جہاں اللہ کا قانون نافذ نہ ہو۔ اسلام نے ایسی حالت میں مسلمانوں کے لئے صرف دو راہیں مقرر کی ہیں یا تو جدوجہد کر کے وہاں دارالاسلام بنالیں یا ناکامی کی شکل میں وہاں سے ہجرت کر کے دوسری ایسی جگہ چلے جائیں جہاں دارالاسلام کے قیام کا امکان وہاں سے بہتر ہو۔

ہجرت کا صحیح مقصد یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ اسلام میں ہجرت کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ کسی حکومت کے مظالم سے تنگ آکر اپنی ذات کی حفاظت کے لئے بہتر مقام میں پناہ حاصل کر لی جائے۔ ہجرت اور فرار دو مختلف چیزیں ہیں۔ ہجرت ذریعہ ہے کسی بڑے مقصد کے حصول کا نہ کہ انفرادی حفاظت کا اس لئے ہجرت ایسے مقام کو کرنی چاہیئے۔ جہاں استقلال حاصل کر کے اسی جگہ یا کسی دوسری جگہ اسلامی اسٹیٹ قائم کی جائے جیسے رسول کریم اور ان کے صحابہ کرام نے کیا۔ بہر حال ہجرت۔ جہاد اور تیاری جہاد کے علاوہ اسلام کے نزدیک جو لوگ دارالکفر (یعنی جہاں نظام اسلامی قایم ہو یا نہ قائم کرنے کی جدوجہد ہو) میں بستے ہوں۔ وہ مردہ ہیں ان کی حفاظت کی کوئی ذمہ داری دارالاسلام کے بسنے والوں پر نہیں ہے سوائے

اس حالت کے جب وہ دارالحرب کو دارالاسلام میں تبدیل کرنے کے لئے جدوجہد شروع کریں جب وہ خود اپنے اوپر ظلم کرنا چاہیں تو ان کی کون مدد کر سکتا ہے۔

چنانچہ حدیث میں ہے:۔

"جسنے مشرکوں کے ساتھ رہنا اختیار کیا اس کا میں ذمہ دار نہیں ہوں"

دوسری حدیث میں ہے۔

"میں ہر اس مسلمان کی حفاظت سے بری الذمہ ہوں جو مشرکوں کی عملداری میں رہتا ہو" اسی طرح قران مجید میں فرمایا ہے۔

"اور جو لوگ ایمان تو لائے مگر دارالکفر سے ہجرت کر کے دارالاسلام میں چلے نہ آئے ان کی دوستی اور حمایت وحفاظت کا کوئی حق تم پر (یعنی دارالاسلام کے مسلمانوں پر) نہیں ہے۔ جب تک کہ وہ دارالاسلام میں ہجرت کر کے نہ آجائیں۔ البتہ اگر وہ دین کے معاملے میں تم سے مدد مانگیں تو ان کی مدد کرنا تمہارا فرض ہے۔ لیکن کسی ایسی قوم کے مقابلے میں تم ان کی مدد نہیں کر سکتے جس سے تمہارا معاہدہ ہو چکا ہو"

ظاہر ہے کہ جب قران کریم نے دارالحرب کی زندگی کو بہرصورت ناجائز قرار دیا ہے تو وہاں کے پیدا شدہ مسائل کا حل بتانا مقاصد قران کلکے خلاف تھا۔ آج جن مسائل کو حل کرنے میں ہمارے علمائے کرام مصروف ہیں۔ اگر اسلام کا صحیح نظام قائم ہو جائے تو ان کا وجود ہی نہیں ہو سکتا۔ مثلاً بنکنگ، لین دین، سود، مسلم وغیر مسلم قضاۃ اور محصولات وغیرہ ان کا وجود ہی غیر اسلامی ماحول کا نتیجہ ہے۔ اس لئے ان کا علاج ان مسائل کا جزوی حل نہیں بلکہ نظام اسلام کا قیام ہے پس غلامی میں رہنے کے جن طریقوں میں قرآن مجید نے رہنمائی نہیں کی ان کا حل پیش کرنے کی کوشش اس نظام کے وجود کو

جائز تسلیم کرتا ہے جو بذات خود ناجائز ہے ؎

ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب
کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق (اقبالؒ)

اطاعت الٰہی کے سوا ہر اطاعت کفر ہے

اسلام کی بنیاد محض اللہ کی اطاعت پر ہے۔ اطاعت رسول یا اس کے جانشین یا ان کے مقرر کئے ہوئے امراء کی اطاعت بھی اطاعت الٰہی ہی کا ایک ذریعہ ہے۔ امیر کی اطاعت اسوقت تک واجب ہے جب تک وہ احکام الٰہی کو اس کے بنائے ہوئے طریقے کے مطابق نافذ کرے ورنہ ظالم امیر کے خلاف آوازۂ حق بلند نہ کرنا سب سے بڑا گناہ ہے۔

قرآن کریم میں امیر کے لئے "اُولِی الْاَمرِ مِنکُمْ" استعمال کیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ "ایسا امیر جو تم میں سے ہو یعنی مسلمان ہو اور مسلمانوں کا اعتماد اس کو حاصل ہو"۔

ان تین اطاعتوں کے علاوہ جن کا مقصد در اصل ایک ہی اطاعت یعنی اطاعت الٰہی ہے ہر اطاعت شرک ہے اور ایسی حکومت جس میں خالص اطاعتِ الٰہی نہ ہو غیر اسلامی حکومت ہے۔ دار الاسلام صرف وہ مقام حکومت ہے جہاں اسلام کا ہر قانون رائج ہو اور اسلام بحیثیت طاقت کے تمام حدود و حکومت میں نافذ ہو، جہاں کسی طور سے انسان پر انسان کی حکومت کا پتہ نہ ہو صرف خدا کی حکومت ہو ایسی حکومت خلافت راشدہ اور حضرت عمر بن عبد العزیز کے ڈھائی سالہ دور کے بعد آج تک قیام میں نہیں آئی آج تمام کرۂ ارض اس قسم کی حکومت سے خالی ہے اس لئے اس میں کوئی شک نہیں کہ آج دنیا کے کسی حصے میں دار الاسلام کا صحیح نظام قائم نہیں ہے ایسی شکل میں ہندوستان

سے افغانستان یا دوسرے مسلمان ممالک میں ہجرت کرنا اسلامی اصول کے غیر مطابق ہے۔

فرق مراتب

یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ ہر وہ مسلمان جو دارالکفر میں رہتا ہے شرک کا مرتکب نہیں ہو سکتا دارالکفر میں جو لوگ دل سے انقلاب اسلامی کے خواہاں اور ہر لحظہ اس انقلاب کو بروئے کار لانے میں مساعی ہیں۔ جن کی زندگی کا مقصد ہی دارالاسلام کا قیام ہے اور جنہوں نے اپنی خواب نوشیں کی راحتوں کو اسی دھن میں خیر باد کہہ رکھا ہے ان کے مسلمان اور مومن ہونے میں کیا شک ہے؟

جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام نے عزیز مصر کی غیر مسلم حکومت میں وزارت قبول فرما کر داخلی انقلاب کی کامیاب کوشش کی اور امام ابو یوسفؒ نے ہارون الرشید جیسے ملوکیت پرست خلیفہ کے ساتھ تعاون کر کے قانون اسلامی کے اجراء کی سعی پیہم کی اور جاہلیت کے اس انقلاب کے طوفان کو روکنے میں جدوجہد کی جو اسلام میں تیزی سے داخل ہو رہا تھا۔ اسی طرح کسی غیر اسلامی نظام سے وابستگی پیدا کر لینا جائز ہے اگر اس کا مقصد انقلاب اسلامی کے لئے زمین تیار کرنا ہے۔ جو لوگ نظام غیر اسلامی میں طوعاً و کرہاً رہتے ہیں مگر دل سے اپنے گناہ پر نادم اور انقلاب اسلامی کے متمنی ہیں وہ بھی دوسرے درجہ پر مسلمان ہیں ایسی غیر اسلامی حکومتوں کی اطاعت اسوقت تک طوعاً و کرہاً گوارا ہے جبتک کوئی اہل ہمت خروج نہ کرے اور سامان بہم کر کے اعلان جنگ نہ کرے اسلام نے بدامنی اور "انارکی" کے مقابلہ میں عارضی اطاعت کا حکم دیا ہے۔ اسی لئے امام ابو حنیفہ نے ابراہیم بن میمون کو جو ایک دیندار عالم تھے اور خلافت عباسیہ کے خلاف خاموشی کو گناہ سمجھتے تھے سمجھایا تھا کہ "امر بالمعروف بے شبہ فرض ہے مگر اس کے لئے سامان شرط ہے۔"

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ سامان نہ ہونے کی وجہ سے مسلمان اس غیر اسلامی نظام

سے مکمل وابستگی پیدا کرلیں بلکہ ہر لمحہ اور ہر گھڑی ان کو جدوجہد اور اس نظام کو ختم کرنے کی تیاریوں میں مصروف رہنا چاہئے اور اس نظام سے کوئی واسطہ نہ رکھنا چاہئے صرف اس کے خلاف بغاوت کو اس وقت تک منع کیا گیا ہے جب تک کہ حکومت صریحاً گناہ پر مجبور نہ کرے لیکن جو لوگ غیر اسلامی طاقتوں کی وفاداری کا سبق دیتے ہیں جو غیر فطری ماحول سے سازو تعاون رکھنا چاہتے ہیں اور اس ماحول کی اطاعت و اعانت واجب سمجھتے ہیں ان کا معاملہ خدا کے ساتھ ہے خدا ان پر رحم کرے سہ

ـــ از غلامی فطرت آزاد را رسوا مکن ٭ تا تراشی خواجۂ از برہمن کافر تری

اس تمام بحث کا ماحصل یہ ہے کہ انسان صرف ایک طاقت اور محض ایک حکومت کی اطاعت کرسکتا ہے اور وہ اطاعت خدا ہے۔

وَمَا اُمِرُوا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ حُنَفَاءَ ط ۹۸/۵	انسانوں کو کوئی حکم نہیں دیا گیا سوائے اس کے کہ اللہ کی اطاعت کریں سب کو چھوڑ کر صرف اس کی اطاعت کریں

ـــ اسی طرح خدا کے بنائے ہوئے راستے پر شارع اسلام کی رہنمائی میں ثابت قدمی سے چلتے اور تمام شکوک و شبہات کو دور کرکے صرف اللہ اور اس کے بنائے ہوئے قوانین کی عملی اطاعت کا نام "ایمان" ہے نہ کہ صرف زبان سے اقرار کرلینے کا۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَجَاھَدُوْا بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصّٰدِقُوْنَ	مومن تو وہ لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر (دل سے) یقین لائے پھر ان کو کسی طرح کا شک نہیں رہا اور انہوں نے اپنی جان و مال سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا

ایسے ہی لوگ سچے ہیں۔

یہی وہ "منشور توحید" ہے جو ہر نبی نے مختلف اوقات میں مختلف اقوام و ممالک میں اپنے ہمعصر حکمرانوں کو پہنچایا۔ اسی اعلان کو لے کر حضرت ابراہیمؑ نے نمرود کے اور حضرت موسٰیؑ نے فرعون کے خلاف نعرۂ جنگ بلند کیا تھا۔ ان طاغوتی طاقتوں کے خلاف انبیاء کرام کا اعلان جنگ محض اس لئے نہ تھا کہ وہ اپنے اختیارات اور حکومتوں کو قائم رکھتے ہوئے صرف خدا کو خالقِ کائنات تسلیم کرلیں جیسا کہ خلافتِ راشدہ کے بعد سے آجتک بیشتر علماء کا طرز عمل رہا ہے جنھوں نے صرف زبان سے خالق ارض و سما کی ہستی کے اقرار کو توحید و ایمان سمجھ کر ہر غیر الٰہی حکومتِ وقت کے ساتھ تعاون و اطاعت کو جائز قرار دیا ان کے متعلق علامہ اقبالؒ نے صحیح فرمایا ہے۔

گرچہ بر لب ہائے او نامِ خداست   قبلۂ او طاقتِ فرماں رواست

انبیائے کرام کے سامنے اگرچہ صرف یہی مقصد ہوتا تو ملوک وقت سے جنگ کرنے کی کیا ضرورت تھی، اور اگر ان انسانی حکومتوں اور طاغوتی طاقتوں کو ہٹا کر حکومت الٰہیہ کا قیام ان کا نصب العین نہ تھا تو فرعون و نمرود اور شداد کا ان انبیاء سے الجھنے کا آخر کیا مقصد؟ حضرت موسٰیؑ کو ابتلاء و آزمائش میں ڈالنے حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں گرانے اور حضرت عیسٰیؑ کو صلیب پر لٹکانے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

جہاں تک قرآن کریم ہماری رہنمائی کرتا ہے ان ملوک باطل کے جس اعلان ربوبیت نے پیغمبرانِ خدا کو ان سے جنگ کرنے پر مجبور کیا تھا وہ یہ تھا کہ وہ تمام انسانوں کی گردن اطاعت خدائی قانون کے بجائے اپنے حکم کے سامنے جھکانا چاہتے تھے۔ دولت و سلطنت کو وہ اپنی ملک خود کو انسانوں کا مربی و رازق اور انسانوں کو اپنا غلام سمجھتے تھے یہی جرم عظیم

تھا جس کے خلاف اپنی قوم سے خطاب کرتے ہوئے ہر نبی نے اعلان کیا۔

اُعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ

اللہ کی اطاعت کرو اس کے سوا کوئی تمہارا مالک نہیں ہے۔

پس روئے زمین پر خدا کی بادشاہت کا قیام ہی اسلام کا پروگرام ہے جو ازل سے اس وقت تک دنیا میں جاری ہے اس نظام کو قائم کرنے والی تمام امتوں کا ایک ہی نصب العین رہا ہے حقیقت میں یہ سب اُمتیں ایک ہی ہیں جو اسلام کے رشتے میں منسلک ہیں

اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ ط

(ان تمام رسولوں کے ذریعہ ہم نے جو تعلیم دی تھی وہ یہی تھی) یہ تم سب کی امت فی الحقیقت ایک ہی امت ہے اور میں ہی تم سب کا پروردگار ہوں پس چاہئے کہ میری ہی اطاعت کرو۔

اسلامی حکومت کا یہ سیاسی نظریہ جدید مفکرینِ سیاست کے نزدیک نا قابلِ فہم اور عجیب معلوم ہوتا ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو خداوند تعالیٰ کو حاکمِ اعلیٰ ماننے اور صرف قوانینِ الٰہیہ کو واجب اطاعت تسلیم کرنے سے افراد کے باہمی تعلقات کی وضاحت جس قدر اس نظریئے میں پائی جاتی ہے اتنی کسی جدید یا قدیم نظریئے میں موجود نہیں ہے۔ اس نظریے کا مطلب یہ ہے کہ انسان ایک دوسرے کے ساتھ مساوی حقوق رکھتے ہیں کسی ایک فرد یا افراد کی کسی مخصوص جماعت کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنے ہی جیسے انسانوں پر حکومت کر سکے خود کو حاکم اور دوسروں کو محکوم سمجھ سکے اور اپنی حسبِ منشاء قوانین نافذ کر سکے یہ حقوق حاکمیت صرف خدا کیلئے مخصوص ہیں اور جو فرد یا جماعت ان میں کسی ایک حق کا دعویٰ کرتی ہے وہ خدا سے شرک یا بغاوت کے جرم کی مرتکب ہے۔ اسی

طرح کسی فرد کے لئے جائز نہیں کہ وہ دوسرے کسی فرد یا جماعت کو اپنا حاکم اعلیٰ یا آقا یا حکمراں تسلیم کرے یا خود کو محکوم و مغلوب و رعیت سمجھ کر کسی دوسری طاقت کو غالب یا حکمراں تسلیم کرنا اس نظریے کی رو سے سب سے بڑا جرم ہے کیونکہ لَا غَالِبَ اِلَّا اللّٰہ کی تعلیم پر اس نظریے کی بنیاد ہے۔

خلافت کا صحیح مفہوم اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً کے خدائی ارشاد کے مطابق تمام انسان اس زمین پر خدا کے نائب ہیں۔ خدا کے احکام و اوامر کی تعمیل و اطاعت کرنا اور اس کے قوانین و اصول کا نفاذ و اجراء ہر انسان کا فرض اولین ہے۔

خلافت ارضی کا یہ بارِ گراں بہت سے فرائض اور ذمہ داریوں کا حامل ہے۔ زمین سے ظلم و طغیان اور سرکشی و طغیان کو مٹا کر عدل و مساوات، امن و محبت اور رواداری کا قائم کرنا اس امانت کا جزو لاینفک ہے۔

ان فرائض سے آسانی کے ساتھ عہدہ برآ ہونے کے لئے قدرت نے انسان کو چھوٹے پیمانے پر بعض تخلیقی قوتیں بھی عطا کی ہیں تاکہ ان قوتوں سے کام لے کر وہ کائنات کی ہر شے کو جو اسی کے لئے مسخر[1] و مخلوق ہے۔ قیام حق و باطل کے لئے استعمال کر سکے، لیکن ساتھ ہی ساتھ خیر و شر[2] کی متضاد قوتیں بھی انسان میں جمع کر دی گئی ہیں۔ تاکہ ان کی باہمی آویزش، اس کے جذبۂ عمل کو متحرک اور ان تخلیقی

---

[1] وَسَخَّرَ لَکُمْ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا

[2] مجوسیوں کے عقیدے کی رو سے "خیر و شر" دو طاقتیں ہیں۔ جن کے وجود کی خالق دو مختلف ہستیاں ہیں۔ ایک اہرمن اور دوسری یزدان ہے۔ لیکن اسلام کے نزدیک "خیر و شر" کا خالق اللہ ہی ہے جو کائنات کی ہر شے کا خالق ہے۔ اس فرق کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔

قوتوں کو بیدار رکھ سکے۔ کفر و ایمان کی باہمی ستیزہ کاری جو ازل سے اب تک جاری ہے۔ اسی آویزش کا نتیجہ ہے۔ لیکن قدرت کی خاموش رہنمائی کے باوجود انسان مجموعی طور سے شیطان کے دجل و فریب پر کامیابی حاصل نہ کر سکا۔ ابتدائے آفرینش سے آجتک عالمِ انسانیت کا کثیر مغلوبِ شر ہی رہا۔ اس شکست خوردہ گروہ نے **قالوا بلٰی** کے ازلی عہد و پیمان کو فراموش کر کے کبھی خلافت ارضی کی امانت کو سنبھالنے کا خیال نہ کیا۔ بلکہ خود زمین پر ظلمت و فساد کا بیج بونے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ ایسی حالت میں "نیکیوں کا حکم دینے اور برائیوں کو روکنے" کی ذمہ داری صرف اس جماعتِ انسانی پر ڈالی جاسکتی تھی جو احکام الٰہی کی آیات پر ایمان محکم رکھتی ہو اور اعمال صالحہ سے آراستہ ہو۔ **اَنَّ الاَرضَ یَرِثُھَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُونَ** ۔ زمین کی خلافت کے فرائض و حقوق ان افراد کو عطا کئے گئے جنہوں نے **حکومت الٰہیہ** کے تمام دستور العمل پر ایمان لاکر اس کے قیام کے لئے جد و جہد کی جن کے متعلق فرمایا:-

اَلَّذِینَ اِن مَّکَّنّٰھُم فِی الاَرضِ اَقَامُوا الصَّلوٰةَ وَاٰتَوُا الزَّکوٰةَ وَاَمَرُوا بِالمَعرُوفِ وَنَھَوا عَنِ المُنکَرِ	یہ وہ لوگ ہیں جن کو اگر ہم زمین میں تمکن (حکومت) عطا کریں گے تو یہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم کریں گے اور بدی سے روکیں گے۔

تمام انسانوں میں درحقیقت یہی جماعت بہترین جماعت تھی جس نے خلافت الٰہیہ کے نظام کو اپنے کاندھوں پر اٹھانے کی کوشش کی۔

کُنتُم خَیرَ اُمَّةٍ اُخرِجَت لِلنَّاسِ تَامُرُونَ بِالمَعرُوفِ وَتَنھَونَ عَنِ المُنکَرِ وَتُؤمِنُونَ بِاللّٰہِ۔	تم وہ بہترین جماعت ہو جسے نوعِ انسانی کے لئے نکالا گیا ہے، تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور بدی سے روکتے ہو۔ اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

لہذا تمام انسانوں میں سے صرف ان لوگوں کو خلافت الٰہی کے بارِ گراں کو اٹھانے کے لئے منتخب کیا گیا جو اس کے مستحق تھے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ	اللہ نے وعدہ کیا ہے ان لوگوں کے ساتھ جو تم میں سے ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ ان کو زمین میں اپنا خلیفہ بنائیگا اسی طرح جس طرح ان سے پہلے اس نے دوسروں کو بنایا تھا۔

اس طرح ہر مسلمان زمین پر شاہد علی الناس، خدا کا نائب اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں براہ راست خدا کے سامنے جواب دہ ہے دنیا میں امن و امان کے قیام کی ذمہ داری اسی کے کاندھوں پر ہے۔

كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ۔	تم میں سے ہر شخص راعی ہے اور ہر راعی خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔

لیکن کسی نظام کو باقاعدہ چلانے کیلئے ایک مرکز کی ضرورت ہے جب تک مشین کے تمام پرزے ایک مرکز سے وابستہ نہ ہوں گے مشین متحرک نہیں ہو سکتی۔ اس لئے لازم ہے کہ تمام مسلمان اپنے انفرادی حقوق و فرائض خلافت کو اپنی مرضی سے اپنے ہی منتخب کردہ ایک نمائندے کی ذات میں مرکوز کر دیں جس کو وہ اس امانت کا اہل سمجھتے ہیں اس طرح تمام ملت کا ضمیر اجتماعی اس ایک فرد کے وجود میں عمل پیرا ہوتا ہے۔ پس درحقیقت سیاسی حکومت کی کفیل و امین تمام ملت اسلامیہ ہے نہ کہ کوئی خاص فرد واحد اور اس طرح پر منتخب شدہ "امیر" ملت کی اس طاقت کا مظہر و نمائندہ ہے نہ کہ بذاتِ خود مطلق العنان آمر

ملت اسلامیہ اس کو اسی طرح معزول بھی کر سکتی ہے وہ ایک طرف عامۃ المسلمین کو جواب دہ ہے تو دوسری طرف اور افراد کی طرح اس حقیقی آقا و مالک کے سامنے جس کے مقرر کردہ اوامر و نواہی کا انفاذ اس کا فرض ہے۔ اس طرح منتخب شدہ امیر کو "خلیفہ" اور اس ادارہ حکومت کو "خلافت" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

علامہ ابن خلدون کی تشریح خلافت

بعض علماء اسلام کے نزدیک دین کو قائم رکھنے اور قوم کی حفاظت کرنے میں آنحضرت کی قائم مقامی کو "خلافت" کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اپنی مشہور تصنیف "مقدمہ" میں علامہ ابن خلدون نے خلافت پر اس طرح بحث کی ہے:۔

سیاست عقلیہ محض فلاح دنیا کے لئے ہے جس سے محض دنیا کی ظاہری باتیں معلوم ہو جاتی ہیں اور بس۔ اور شارع کا مقصود ہے اصلاح آخرت اس لئے ضرور ہے کہ بمقتضای شریعت عامۂ خلائق دینی اور دنیاوی امور میں شریعت کے احکام کی کاربند رہے پس جو لوگ منجانب اللہ اشاعت شریعت پر مامور ہوتے ہیں، انہیں انبیاء اور رسول کہتے ہیں اور جو آن کے بعد ان کے قائمقام ہو کر اُن کے قانون کی حفاظت کرتے ہیں خلفاء کہلاتے ہیں اب ہمیں مملکت اور عقلی سیاست و خلافت نبوی کی تعریف یوں کرنی چاہیئے کہ طبیعت مملکت عامہ خلائق کو شہوانی اغراض و ہوا و ہوس کے پورا کرنے پر مجبور کرتی ہے اور مملکت سیاسیہ حسب مقتضائے عقل دنیاوی منفعت کے حصول اور دنیاوی نقصان کے دفع کرنے کا ذریعہ ہے اور خلافت احکام شرعیہ کے موافق

ہی انسان کو اُخروی و دنیاوی مصالح کے راستے پر چلاتی ہے آخرت تو اس کا مقصود بالذات ہی ہے۔ رہے معاملات دنیاوی تو وہ بھی شارع کے نزدیک بتمامہا مصالح اُخرویہ کی طرف راجع ہیں کیونکہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے پس گویا خلافت حراست دین و سیاست دنیوی دونوں کے مجموعے کو کہتے ہیں۔

کبھی کبھی خلافت پر امامت کا بھی اطلاق ہوتا ہے اور جو اس نیابت کے فرائض کا بار گراں اپنے ذمہ رکھتا ہے۔ خلیفہ و امام کہلاتا ہے۔ امام اسلئے کہ جیسے امام نماز کا اتباع و اقتدار ہوتا ہے اس کا اتباع بھی ہوتا ہے۔ بلکہ یہ امامت کبریٰ ہے اس لئے کہ جمیع احکام میں اس کا اقتدار امت کو کرنا پڑتا ہے اور خلیفہ اس مناسبت سے کہ چونکہ نبی اپنی امت میں اسے اپنا جانشین چھوڑتا ہے اس لئے وہ خلیفہ ہوا خلیفہ کبھی محض خلیفہ کہلاتا ہے اور کبھی خلیفۂ رسول اللہ۔ البتہ خلیفۃ اللہ کے کہنے میں علماء کو اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک جائز ہے اس کا ماخذ یہ آیت ہے " انی جاعل فی الارض خلیفۃ، وجعلکم خلائف الارض۔ گویا یہ لوگ خلافت عامہ کی وجہ سے جو بنی آدم کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور و مقرر ہے اسے خلیفۃ اللہ کہتے ہیں لیکن جمہور علماء اس مسلک کے خلاف ہیں کیونکہ ان کے نزدیک آیات مذکورۂ بالا کے معنی اس کی خلافت پر دلالت نہیں کرتے۔

اسی طرح علامہ ابوالحسن الماوردی "احکام السلطانیہ" میں فرماتے ہیں:—

"نبوت کی جانشینی کے لئے امامت ہے تاکہ دین کی حفاظت ہو اور دنیا کا انتظام برقرار رہے کسی نہ کسی شخص کا اجماع امت سے امام مقرر کیا جانا واجب ہے۔"

درحقیقت یہ دونوں نظریات اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں اجماع امت سے منتخب کردہ امیر چونکہ شریعت نبوی کا نافذ کرنے والا ہوتا ہے اس لئے وہ پیغمبر کا قائم مقام ہے اور چونکہ شریعت نبوی احکام و قوانین الٰہیہ کا ہی دوسرا نام ہے جو انبیا کے ذریعہ انسانوں تک بھیجے جاتے ہیں۔ اس لئے وہ زمین پر خدا کا نائب اور اس کی حکومت کو قائم کرنے والا ہے فرق صرف اس قدر ہے کہ وہ خدا کا بالواسطہ اور انبیاء کا بلاواسطہ قائم مقام ہے۔

شیعی نظریۂ خلافت

اہل تشیع و اہل سنّت والجماعت کے نظریات خلافت میں بڑا زبردست اختلاف ہے۔ اور درحقیقت یہی اختلاف مسلمانوں کی ان دو بڑی جماعتوں میں باہم افتراق و نزاع کا سبب رہا ہے جس کے مہلک نتائج سے اب تک امان نہ مل سکی اس لئے ہم اس فرسودہ و پامال بحث میں وقت ضائع کرنا نہیں چاہتے یہاں صرف تاریخی حیثیت سے شیعی نظریۂ خلافت کا ایک مختصر خاکہ کھینچنا مقصود ہے۔ علماء شیعہ حکومت و خلافت کا منبع خود خدا کو سمجھتے ہیں۔ ان کے اعتقاد کے مطابق امام کو زمین پر حکومت کرنے کا الٰہی حق (DIVINE RIGHT) ہے وہ امام کو مامور من اللہ سمجھتے ہیں۔ اس

لیے عوام مسلمین کو خلیفہ کے انتخاب کا کوئی حق نہیں ہے اس کے فیصلے معصوم اور آخری ہوتے ہیں وہ تمام علوم و کمالات کا جامع اور فوق البشری ادراک و فراست کا حامل ہوتا ہے ایک فرقہ جس کو ابن خلدون نے شیعہ غالی لکھا ہے ائمہ کے صفات آلہیہ سے متصف ہونے کا قائل ہے انھیں میں سے دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ خدا ان کی بشری ذات میں حلول کر گیا ہے - یہ عقیدہ بالکل ایسا ہے جیسا کہ عیسائیوں کا حضرت عیسٰی کے متعلق تھا حضرت علی کو جب ان لوگوں کا حال معلوم ہوا تو آپ نے ان کو آگ میں جلوا دیا۔ محمد بن الحنفیہ اور امام جعفر صادق نے بھی اس قسم کے لوگوں پر لعنت و ملامت کی۔ حضرت علیؓ ان کے سب سے پہلے امام اور آنحضرتؐ کے براہ راست جانشین ہیں - حضرت علیؓ کے بلا واسطہ خلاف آپ کے مقرر کردہ جانشین ہیں ان کا خیال ہے کہ آیۂ اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم میں اولی الامر سے حضرت علی کی ذات بابرکات مراد ہے۔ کیونکہ اطاعت سے مراد اطاعت حکم و قضا ہی ہے اور آپ ہی بدلالت حدیث رسولؐ من کنت مولاہ فعلیٌّ مولاہٗ حکم و قضا کے زیادہ اہل تھے۔ اسی لئے آپ کو حضرت عمرؓ نے خطاب کر کے فرمایا تھا اقضنا کم علیؓ - نبی آخر الزمان نے زمانۂ حج میں سورۂ برأۃ کے ابلاغ کیلئے مکہ معظمہ پہلے حضرت ابوبکرؓ کو بھیجا لیکن بعد کو حضرت علی کو بھیج دیا تھا۔ شیعہ علماء کی رائے میں یہ ردو بدل حضرت علی کی تقدیم مرتبت پر دلالت کرتا ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے کبھی حضرت علی پر کسی کو امام مقرر نہیں کیا اور حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ پر دو غزووں میں اسامہ بن زیدؓ اور عمرو بن العاص کو سردار

گیا۔ جو لوگ اولادِ علیؓ میں انتقال امامت کے قائل ہیں "امامیہ" کہلاتے ہیں اور شیخینؓ سے اپنی بے تعلقی ظاہر کرتے ہیں۔ یہ لوگ شیخین کی امامت کو تسلیم نہیں کرتے۔

فرقہ زیدیہ جو حضرت زید بن علی بن حسین الشہید سے منسوب ہے شیخین کی امامت میں قدح نہیں کرتا ان کا خیال ہے کہ ان کو حضرت علی کے اوصاف کے مصداق اور اطلاق میں دھوکا ہوا اور وہ حقیقت حال کو نہ سمجھ سکے اس لئے وہ معذور ہیں۔ اکثر شیعوں نے جب دیکھا کہ حضرت زید شیخین کی امامت کے قائل ہیں۔ اور تبرا سے اجتناب کرتے ہیں تو ان کی امامت و تقلید کو ترک کر دیا اور ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ قوم کے ساتھ چھوڑ دینے پر آپ نے فرمایا: " یَا قَوْمِ اَرَفَضْتُمُوْنِیْ " یعنی اے میری قوم تو نے مجھے چھوڑ دیا۔ ابن خلدون نے اُن کو "فرقۂ روافض" کے نام سے موسوم ہونے کی یہی وجہ بتائی ہے فرقۂ زیدیہ کے پیرو امام کو مامور من اللہ نہیں سمجھتے بلکہ اہل حل و عقد کی رائے پر منحصر سمجھتے ہیں۔

امامت کے معاملے میں امام جعفر صادق تک شیعوں میں کوئی اختلاف نہ ہوا لیکن ان کے بعد امامیوں کے دو فرقے ہو گئے ایک فرقہ آپ کے بیٹے حضرت اسمٰعیل کی امامت کا قائل ہوا اور اسمٰعیلیہ کہلایا۔

دوسرے گروہ نے حضرت موسےٰ کاظم کی امامت کو قبول کیا اس سے وہ "اثنا عشری" کہلائے۔ اسمٰعیلیہ کو "باطنیہ" بھی کہتے ہیں۔ ان کے بارھویں امام محمد بن الحسن عسکری الملقب بہ مہدی کو فرقہ کے نزدیک اثنا عشری

عقیدے کے مطابق (مع والدہ خود) اچانک غائب ہو گئے وہ پھر دوبارہ ظہور فرمائیں گے۔ ان کا خیال ہے کہ دنیا بغیر امام کے ہرگز زندہ نہیں رہ سکتی خواہ امام حاضر ہو یا غائب۔ ان کا عقیدہ ہے کہ جب ایک امام کا انتقال ہوتا ہے تو اس کی روح دوسرے امام کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ تاکہ اس میں بعینہ وہی کمال ہو۔ ایک فرقہ جس کا نام "واقفیہ" ہے فقط ایک امام کو مانتا ہے اور اس کے دوام حیات کا قائل ہے۔ حضرت علیؓ کی نسبت بھی بعض شیعہ یہی خیال کرتے ہیں اور یہی خیال بعض کا محمد بن الحنفیہ کے متعلق بھی ہے وہ کہتے ہیں کہ وہ اب تک حجاز کی سرزمین اور جبل رضوی میں موجود ہیں اور جب تک کفار کے لشکر جرار سے معرکہ آرا نہ ہوں گے زندہ رہیں گے۔

خوارج کا نظریہ خلافت

مسئلہ خلافت کے متعلق "خوارج" تین گروہوں میں منقسم ہیں (۱) یہ گروہ خلیفہ کے انتخاب کا قائل ہے سوائے عورت اور غلام کے ہر شخص بلا لحاظ نسل یا قبیلہ خلیفہ ہو سکتا ہے دوسرا گروہ خلیفہ کی ضرورت ہی نہیں سمجھتا۔ عامۃ المسلمین اپنے حالات کے خود نگراں ہیں۔ یہ گروہ عوام کی نمایندگی کو ایک ذات میں مرکوز کر دینے کے خلاف ہے

تیسرے گروہ کے نزدیک کسی ادارۂ خلافت و حکومت کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ انھیں لوگوں کو حضرت علیؓ نے خطاب کر کے فرمایا تھا:

"تم کسی نظام حکومت پر ایمان نہیں رکھتے۔ مگر نظام و حکومت کے بغیر چارہ نہیں خواہ اچھا ہو یا برا"

اسلام میں "اسٹیٹ" کی حیثیت

"اسٹیٹ" انسانوں کے اس مجموعے کو کہتے ہیں جو ایک معیّن رقبے میں حکومت اور محکوم کی شکل میں ہو۔ اور وہ لوگ باہم ایک رشتۂ حکومت میں متحد ہوں۔ یا مختصراً "کسی خاص ملک کی سیاسی طور پر تنظیم پائی ہوئی قومی شخصیت" کو اسٹیٹ کہتے ہیں۔ (ڈاکٹر ہینچلی)

اسٹیٹ موجودہ تخیل کی رو سے چار اجزاء پر مشتمل ہے (۱) آدمیوں کی ایک تعداد PEOPLE روسو نے یہ تعداد کم از کم دس ہزار بیان کی ہے۔ (۲) رقبہ معینہ TERRITORY یعنی ایک خاص زمین میں قوم کا مستقل تعلق ہونا چاہیئے۔ خانہ بدوش اقوام میں حکومت کے تمام قوانین موجود ہونے کے باوجود ان کو "اسٹیٹ" سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ان کا تعلق کسی خاص ملک یا زمین سے نہیں رہتا۔ (۳) کل افراد کا اتحاد UNITY یعنی قوم کے ہر فرد کا اپنے آپ کو ایک ہی کُل کا جزو سمجھنا (۴) حکومت یا گورنمنٹ، حکومت کا طرز خواہ کسی قسم کا ہو لیکن قوانین کے نافذ کرنے والی ایک طاقت کا وجود ضروری ہے۔ حکومت کے بدل جانے سے اسٹیٹ کی تشکیل میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

"اسٹیٹ" (ریاست) بذاتِ خود ایک مقصد ہے یا کسی نصب العین کے حصول کا ذریعہ؟ اس سوال پر مغربی مفکرین نے بہت کچھ طبع آزمائی کی ہے۔

ارسطو کے نزدیک "اسٹیٹ" ایک جماعت ہے جو زندگی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے وجود میں آئی ہے اور زندگی کو بہتر بنانے کے لئے قائم

رکھی جاتی ہے (تاریخ فلسفۂ سیاسیات از محمد مجیب بی۔ اے۔ آکسن)

افلاطون کا نظریۂ سلطنت عینی اور تصوری ہے جس کا اس زمین پر نہ اس کی حیات میں کہیں نشان ملتا نہ آج تک پتہ ہے وہ بھی اسٹیٹ کو حیات قانونی عدل اور مساوات اور بلند اخلاقی پیدا کرنے کا ذریعہ سمجھتا ہے وہ اس اسٹیٹ کو جس کا مقصد محض حاجت برآری ہو اچھا نہیں سمجھتا لیکن افلاطون کی بیشتر تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ افراد کو اسٹیٹ کے اجزا خیال کرتا ہے۔ اسٹیٹ سے علیحدہ ان کی کوئی شخصیت معلوم نہیں ہوتی افراد کو اسٹیٹ پر قربان کیا جا سکتا ہے۔ اسٹیٹ کو افراد کا خدمت گزار نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس لئے اس کے نزدیک اسٹیٹ بذاتِ خود مقصود بھی ہے۔ اس کے نزدیک اسٹیٹ انسانی نیکی کا بلند ترین ظہور اور کامل انسانیت کے مرادف ہے وہ کہتا ہے کہ "سب سے بہتر سلطنت وہ ہے جو اپنی عضو بندی میں سب سے زیادہ انسانی حالت کے قریب پہنچ سکے۔ جسم کے ایک حصہ پر اگر کوئی آفت آتی ہے تو تمام جسم اس کو محسوس کرتا ہے"۔ یونانی مفکرین کا عام نظریۂ سلطنت یہ ہے کہ "افراد کو اوّل سلطنت میں فنا ہو جانا چاہئے پھر اس کے بعد وہ سلطنت (اسٹیٹ) کے ذریعہ دوبارہ زندہ ہو کر آزاد اور معزز زندگی پا سکتے ہیں"۔ رومی مفکرین کے یہاں اسٹیٹ کا تخیل یونانیوں سے کچھ مختلف ہے انہوں نے سب سے پہلے قانون کو اخلاق سے ممیز کیا اور اسے ایک معیّن شکل میں ڈھالا۔ سسرو کے نزدیک اسٹیٹ انسانی طاقت کی اعلیٰ ترین پیداوار ہے وہ کہتا ہے کہ انسان کسی کام میں خداؤں کی مرضی سے اتنا قریب نہیں جتنا سلطنتوں کی بنا ڈالنے اور ان کو قائم رکھنے

کی کوشش میں۔ رومیوں کے نزدیک اسٹیٹ قوم کی تنظیم شدہ ہیئت کا دوسرا نام ہے۔ اسٹیٹ چونکہ خود انسانوں کی بنا کردہ ہے اس لئے انسان کی فلاح کا ایک ذریعہ ہے ان کے یہاں اسٹیٹ کا مقصد بہبود عامہ SALUS PUBLICA ہے۔ ازمنۂ وسطیٰ میں اسٹیٹ اور چرچ کی باہمی رزم آرائی نے اسٹیٹ کی صحیح پوزیشن کو ہمیشہ مبہم ہی رکھا۔ جب کلیسا نے شہنشاہ سے بالکل علیحدہ روما میں اپنا مستقر بنا لیا۔ تو سلطنت صرف قانون سیاسیات کی ایک معمولی جماعت اور جزو مذہب بن کر رہ گئی۔ جس کا مقصد اشٹال کے الفاظ میں "خدمت خدا کی بجا آوری ہے۔ سلطنت پر لازم ہے کہ خدا کی حکومت قائم کرے۔ اور عدل وانتظام اور اخلاق جو معاشرتی زندگی کے لئے خدا کے احکام ہیں انھیں برقرار رکھے" (نظریۂ سلطنت از بلنچلی صفحہ ۳۶۵)

ٹیوٹنوں نے سلطنت کی مطلق العنانی سے سختی کے ساتھ انکار کیا وہ اس قدیم نظریے کے شدت کے ساتھ مخالف تھے کہ جو کچھ ہے سلطنت ہی ہے وہ اسٹیٹ کو ان کے انفرادی حقوق کی حفاظت کا ایک ذریعہ خیال کرتے تھے کانٹ کے نزدیک اسٹیٹ کا مقصد افراد کے فلاح اور خوشحالی میں نہیں بلکہ اپنے مقام پر سلطنت اور اصول قوانین کے تطابق میں مضمر ہے (نظریۂ حقوق) اسی طرح فشتے کے نزدیک عوام کے حقوق کا تحفظ اسٹیٹ کا مقصد ہے۔ سیاست کے دور جدید کی ابتداء پندرھویں صدی عیسوی کے نصف آخر سے ہوتی ہے۔ اس عہد میں میکیاولی (۱۴۶۹ - ۱۵۲۷) نے یہ تخیل پیش کیا کہ اسٹیٹ کائنات کی اعلیٰ ترین ہستی ہے وہ اس کا غیر معمولی احترام کرتا ہے اور اس سے بیحد الفت کا اظہار

کرتا ہے وہ اس پر ہر شے کو حتیٰ کہ مذہب اور سچائی اور نیکی کو قربان کرنا عین ثواب سمجھتا ہے اس کے نزدیک قانون کا مقصد اسٹیٹ کو ترقی دینا ہے اور اس کی تمام طاقت کی حفاظت کا ایک ذریعہ ہے۔ وہ اسٹیٹ کے مقابلے میں قانون اور اخلاق کو کوئی اہمیت نہیں دیتا اس کے نزدیک اسٹیٹ کے تمام کاموں کا معیار سودمندی ہے۔ اسٹیٹ کا معیار جس امر کا متقاضی ہو صاحب سلطنت کو وہی کرنا چاہئے۔ انگریز اور امریکی ماہرین سیاست اسٹیٹ کو مقصود بالذات نہیں مانتے بلکہ وہ اس کو افراد کی فلاح و بہبود کا ایک ذریعہ مانتے ہیں "مضامین میکالے" میں میکالے نے میکیاولی پر کافی تنقید کی ہے اس کے نزدیک معاشرتی اور قانونی نظام صرف شخصی خوشحالی کی مجموعی مقدار کو بڑھانے کے لئے ہے۔ جان لاک بھی جو معاہدۂ عمرانی کا حامی ہے اسٹیٹ کو ایک ایسی تنظیم سمجھتا ہے جس سے افراد اپنی جان و مال اور شخصی آزادی کی حفاظت حاصل کرتے ہیں اسی طرح روسو کی رائے میں اسٹیٹ افراد کی پیدا کردہ اور انھیں کی آزادی کو برقرار رکھنے کا ایک ذریعہ ہے۔

ہیگل (۱۷۷۰ء تا ۱۸۳۱ء) کے نزدیک اسٹیٹ کا مقصد "اخلاق" اور قانون اخلاق کو عملی جامہ پہنانا ہے۔

ڈاکٹر بلنچلی (۱۸۰۸ء تا ۱۸۸۱ء) کے نزدیک قوم کی قابلیتوں کا نشو و نما قومی زندگی کا کمال اور بالآخر اس کا اتمام اسٹیٹ کا مقصد ہے۔

اسلام اس بارے میں بہت واضح اور غیر مبہم اعلان کرتا ہے اس کے نزدیک "اسٹیٹ" کا موجودہ نظریہ مقصود بالذات نہیں بلکہ حصول مقصد کا

ایک ذریعہ ہے۔ قرآن کریم کی رو سے انسان کا صرف ایک مقصود ہے یعنی "اللہ"
اس تک پہنچنے کا ذریعہ تلاش کرنا (وَابْتَغُوْا اِلَیْہِ الْوَسِیْلَۃَ) اس کی راہ
میں جدوجہد کرنا (جاھدوا فی سبیلہ) اس کے اخلاق اپنے اندر پیدا
کرنا (تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ) اور اسی کی اطاعت وعبادت انسان کا
نصب العین ہے۔ انسان کی تخلیق کا مقصد ہی عبادت آلٰہی ہے وَمَا
خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ ہ

مختصراً انفرادی واجتماعی زندگی کے ہر پہلو میں مکمل توحید الٰہی (جس کا
ایک محدود تخیل موجودہ اصطلاح میں حکومت ربانی یا حکومتِ آلٰہیہ کے نام
سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جس کو قرآن کریم نے دین اسلام کے نام سے موسوم کیا
ہے)۔ انسان کا نصب العین ہے۔ خود اپنے اخلاق کی درستگی اور تکمیل ذات کی
جدوجہد اسی نصب العین کے حصول کے لئے ہے۔ حکومت یا استخلاف فی الارض
یا حکومتِ آلٰہیہ یا دین اسلام کا ایک جزو ہے اگرچہ بہت ضروری جزو جس کے بغیر
دین کی ظاہری تکمیل ناممکن ہے۔ یہ ایک نعمتِ خداوندی ہے اور انسان کے
اعمال صالحہ کا نتیجہ اور ذریعہ ہے ظلم وفساد کو زمین سے دور کرنے اور عدل
مساوات، امن ومحبت کے قیام کا، اسی طرح قوانین اسلامی کا نفاذ ذریعہ ہے۔ انسان
کو خدا کا محکوم بنانے اور اس کی ارضی زندگی کو بہتر بنانے کا اگر حکومت کے قیام
کے بغیر انسان اپنی زندگی کے ہر پہلو میں خدا کو رہنما بنا سکتا ہے اور انبیاء کی
تعلیم پر عمل پیرا ہو سکتا ہے تو کسی حکومت نافذہ کی ضرورت نہیں۔ یہی وجہ
ہے کہ ابتدائے آفرینش میں جب تک انسان حق پرستی اور باہمی محبت امن

کی زندگی بسر کرتا رہا کسی نظام حکومت کے قائم کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی لیکن یہ ابتدائی دور بہت مختصر تھا۔ بہت جلد انسان ارتقائے معاشرت کے اقتضار سے حکومت کی بنیاد ڈالنے پر مجبور ہوا۔ جماعت کی تشکیل انسان کا طبعی اور فطری خاصہ ہے۔ اس کے بغیر نہ تو وہ ایک عارضی مدت کے علاوہ پرامن زندگی بسر کر سکتا ہے اور نہ "دین" کی تکمیل ہی ہو سکتی ہے۔ اسی لئے انبیار کرام نے جماعتی زندگی اور استخلاف فی الارض پر ہمیشہ زور دیا۔ ان میں سے بعض نے اپنی زندگی میں ہی حکومت کی بنیاد قائم کر دی اور بعض نے صرف اس کے لئے زمین تیار کی اور اپنے دائرۂ عمل کو انفرادی اصلاح تک محدود رکھا۔ جس کے بغیر استخلاف فی الارض ناممکن ہے۔ بعض نے حکومت کے ساتھ نئی شریعت بھی پیش کی اور بعض نے پچھلی ہی شریعتوں کے ماتحت امت کو ہدایت کی۔

اسٹیٹ کی ابتداء

انسان فطری طور سے مدنی الطبع واقع ہوا ہے ارسطو کے الفاظ میں۔ "وہ ایک حیوان سیاسی ہے" وہ کہتا ہے کہ

> "اجتماعی زندگی کی خواہش ایک جبلت ہے جو فطرت نے انسانی سیرت میں داخل کر دی ہے اور وہ شخص جو اجتماعی زندگی بسر نہ کر سکے یا جسے اس کی حاجت نہ ہو وہ دیو ہے یا دیوتا"

ارسطو کی رائے میں اسٹیٹ خاندانی اور دیہی زندگی کی تکمیل اور تنظیم کا نام ہے۔ بے شک مرد، عورت اور بچوں کا باہمی مل جل کر رہنا اور ایک ساتھ زندگی بسر کرنا انسان کا فطری خاصہ ہے۔ بسا اوقات ضرورت زندگی ان کو معاشرت پر

مجبور کرتی ہے اور کبھی باہمی محبت اور موانست کے فطری جذبات کی بنا پر وہ ایک ساتھ رہنا پسند کرتے ہیں۔ اسٹیٹ ارسطو کی رائے میں "ان لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے جو بغیر ایک دوسرے کے زندہ نہیں رہ سکتے جیسے مرد اور عورتیں اور جو باہمی ضروریات کی بنا پر ایک دوسرے کے ساتھ اتحاد کرنے پر مجبور ہیں۔ جیسے آقا اور غلام۔ حاکم اور محکوم" چین کے مشہور مفکر سیاست کنفیوشس (۵۵۱ھ تا ۴۷۸ قبل مسیح) کی رائے میں سوسائٹی پانچ عناصر پر مشتمل ہوتی ہے۔ خاوند بیوی، باپ بیٹا، بڑا بھائی، چھوٹا بھائی، حاکم و محکوم اور دوست اور اقربا۔

ان دونوں مفکرین کی رائے میں یہ تمام عناصر ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں۔ حاکم بغیر محکوم کے کوئی وجود نہیں رکھتا۔ بھائی، بیٹا، باپ، خاوند بیوی مل کر فطری طور سے ایک ساتھ رہنے پر مجبور ہیں۔

مرد اور عورت کے تعلق کا نتیجہ افزائش نسل ہے جس سے سب سے پہلے خاندان کی بنیاد پڑتی ہے۔ خاندان کا مقصد انسان کی اُن ابتدائی ضروریات کا پورا کرنا ہے جو نسل کو قائم رکھتی ہیں۔ کئی خاندان مل کر ایک قبیلے کی بنیاد ڈالتے ہیں پروفیسر اڈورڈ جنکس کی رائے ہیں:۔

> "خاندان یا کنبہ وہ چھوٹا گروہ ہوتا ہے جس میں صرف تین چار پشتیں ہوتی ہیں جو سب ایک مشترک مورث کی اولاد ہوتی ہیں اور جب تعداد نفوس معقول ہو جاتی ہے تو وہ جدید کنبوں یا جرگوں میں خود بخود منتشر ہو جاتی ہے۔ برخلاف اس کے قبیلے میں کئی کئی سو نفوس ہوتے ہیں جس میں وہ لوگ جو صحیح النسل ہوتے ہیں۔ خود کو ایک

مورث اعلیٰ کی اولاد سمجھتے ہیں۔ اور صرف مردوں کے رشتے سے
باہم منسلک ہوتے ہیں۔" (تاریخ سیاسیات صفحہ ۱)

اس معاشرۂ آبائی میں حکومت کے اکثر بنیادی اصول کارفرما نظر آتے ہیں خاندان کا سب سے معمر آدمی مطلق العنان حاکم ہے جو تمام افراد کے کاروبار کی دیکھ بھال کرتا ہے اور ان کے مذہبی فرائض کی ادائیگی اور چال چلن کی نگرانی کرتا ہے۔ عرب کے قبائل کی تاریخ اس معاشرہ کی بہترین مثال ہے۔ جب کئی خاندان یا قبیلے ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں تو وہ گاؤں کی بنیاد ڈالتے ہیں۔

دیہی تنظیم کا یہ سلسلہ بڑھ کر شہر تک پہنچتا ہے جہاں سے اسٹیٹ کی ابتداء ہوتی ہے۔ چنانچہ یونانی شہر (ایتھنس) میں اسٹیٹ کے تمام اجزاء موجود ہیں یونانی مفکرین بالخصوص تارقلیس جو ایتھنس کا سب سے پہلا مدبر تھا، کے نزدیک شہر صرف مسکن یا جسمانی حفاظت کی جگہ نہیں ہے بلکہ انسان کی اعلے جدوجہد کا ایک دائرہ ہے۔ اس طرح خاندان کی تنظیم سے شروع ہو کر شہری تنظیم کے ذریعہ اسٹیٹ کی ابتداء ہوتی ہے

معاشرۂ آبائی کے اس تخیل کا خالق ارسطو ہے۔

معاہدہ عمرانی جدید مفکرین سیاست کی بڑی تعداد اسٹیٹ کو انسانوں کے ایک باہمی معاہدہ عمرانی (SOCIAL CONTRACT) کا نتیجہ قرار دیتی ہے ان کی رائے میں انسانوں نے جنگ سے محفوظ رہنے امن کی غرض سے یا اپنی آزادی کی حفاظت کیلئے آپس میں ایک معاہدہ کے ذریعہ اسٹیٹ کو اسیطرح قائم کیا جس طرح چند سرمایہ دار مل کر تجارتی کمپنی قائم کرتے ہیں۔

معاہدۂ عمرانی کو باضابطہ نظریے کی شکل میں پیش کرنے کا سہرا ہابس ، لاک اور روسو کے سر ہے - یہ تینوں مفکرین اسٹیٹ کو ایک معاہدۂ عمرانی کا نتیجہ قرار دیتے ہیں لیکن معاہدہ کے اسباب و نتائج میں ایک دوسرے سے تینوں اختلاف رکھتے ہیں۔ تینوں مفکرین اپنے زمانے کے سیاسی حالات سے بیحد متاثر نظر آتے ہیں۔ اور انہی اثرات پر اسٹیٹ کی بنیاد رکھتے ہیں۔

ہابس (۱۵۸۸ء تا ۱۶۷۹ء) شہنشاہ چارلس اور پارلیمنٹ کی جنگ سے بے حد متاثر ہے اور بادشاہیت کا طرفدار ہے۔ اسکی کتاب "لیویاتھن LEVIATHAN" جو ۱۶۵۱ء میں شائع ہوئی شہنشاہیت کی حمایت میں لکھی گئی تھی۔ اس کے نزدیک انسان فطری طور سے مساوات کا جذبہ اپنے اندر رکھتے ہیں لیکن یہی جذبۂ مساوات فسادات کا باعث ہو جاتا ہے کیونکہ ہر انسان دوسرے انسان کے مقابلہ میں کمتر ہونا نہیں چاہتا بلکہ برتر رہنا چاہتا ہے مگر یہ برتری اور کمتری قوت کے اوپر منحصر ہے جس میں زیادہ قوت ہوتی ہے وہی دوسرے پر سبقت لے جاتا ہے۔ اس طرح باہمی اعتماد ختم ہو جاتا ہے اور ایک دوسرے پر ظلم کرنے اور باہمی جنگ کی حالت نمودار ہو جاتی ہے۔

یہ وہی خیال ہے جس کو حضرت عیسٰی کی پیدائش سے تقریباً تین سو سال قبل ہندوستان کے ایک مفکر کوٹلیہ نے بیان کیا تھا کہ جس طرح سمندر میں بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھا جاتی ہے اسی طرح ابتدائی ایام میں زبردست آدمی کمزور آدمیوں پر ظلم کرتے تھے جس کی وجہ سے بادشاہ کی ضرورت واقع ہوئی۔ ہابس اس حالت کا نقشہ بہت تفصیل کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ اس کے نزدیک حالت جنگ

سے یہی مراد نہیں ہے کہ جنگ باقاعدہ جاری ہو بلکہ جب تک امن کا اعلان نہ ہو جائے جنگ ہی کی حالت سمجھی جائے گی۔ وہ کہتا ہے کہ اگر انسانوں پر کوئی حاکم نہ ہو تو مستقل جنگ کی شکل قائم ہو جائے گی۔ جیسے غیر مہذب قبیلوں میں ایک دوسرے کے خلاف ہر وقت جنگ جاری رہتی ہے۔ انسان فطری طور سے قانون اور حکومت کی موجودگی کے باوجود بھی ایک دوسرے پر شک کرتے ہیں۔ اس کی تائید میں وہ کہتا ہے کہ جب عدالتیں، پولیس اور فوج موجود رہتی ہے تو سفر میں ہتھیار پاس رکھنا۔ سوتے وقت دروازے بند رکھنا اور صندوقوں میں تالے لگائے رکھنا اس امر کی علامت ہے کہ انسان ایک دوسرے پر اعتماد نہیں کرتا۔ ان سب باتوں کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ افراد اپنی حفاظت بیرونی حملوں سے بھی نہیں کر سکتے کیونکہ جب داخلی بدامنی اور فساد موجود ہو تو بیرونی حملوں اور دشمنوں کی روک تھام کون کر سکتا ہے۔ ان سب باتوں کا علاج اس کے سوا کوئی نہیں کہ سب افراد اپنے آپ کو ایک مطلق العنان حاکم کے سپرد کر دیں اور اس کی غیر مشروط اطاعت کو اپنا نصب العین بنالیں۔ اس کے نزدیک انسان کی آزادی سب سے زیادہ خطرناک ہے۔ جو ان تمام نتائج کی ذمہ دار ہے۔ اسی طرح بادشاہ کے خلاف بغاوت کرنا انسان کو ”زمانۂ ماقبل ریاست“ کی طرف لے جانا ہے جس سے بچنے کے لئے اسٹیٹ کا قیام عمل میں آیا تھا۔

”معاہدہ عمرانی“ کے نظریہ کی جو ہابس نے بیان کیا ہے ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کی رُو سے اس میں شرکت کی رضامندی خاموشی سے بھی دی جا سکتی ہے۔ اس طرح جو حکومت بزور شمشیر قائم ہوئی ہو مفتوحہ ممالک کے

باشندوں پر اس کی اطاعت بھی لازم ہے۔ اس کے نزدیک جو معاہدہ خوف سے کیا جاتا ہے وہ قانونِ فطرت کی رو سے درست ہوتا ہے۔ اسٹیٹ کسی باقاعدہ معاہدہ کی محتاج نہیں بلکہ وہ اس کی فطرت، خوف اور ضرورتوں کا لازمی نتیجہ ہے۔

ہابس بادشاہ کی حاکمیت کا اس حد تک قائل ہے کہ اس کے خلاف کوئی شکایت قابلِ تسلیم نہیں۔ اسٹیٹ کا اقتدار اعلیٰ بادشاہ کی ذات ہے جو تمام قوانین سے بالا ہے۔ وہ فرد کو صرف اس وقت حق انکار دیتا ہے جب اس کے ذمے کوئی ایسی مہم سپرد کی جائے جس میں جان کا خطرہ ہو۔ ہابس اسٹیٹ قائم ہونے سے پہلے ایسے معاملہ کا تخیل پیش کرتا ہے جس میں تمام افراد اپنے حقوق سے دستبردار ہو جائیں جن کو واپس لینے کا از خود ان کو کوئی اختیار نہیں اس کے بعد اسٹیٹ کا قیام عمل میں آتا ہے۔

جان لاک (۱۶۳۲ء تا ۱۷۰۴ء) چونکہ ۱۶۸۸ء کے انقلاب میں جیمز دوم کو معزول کرنے والے مدبروں کا حامی ہے، اس لئے اس کا نظریہ معاہدۂ ہابس سے بالکل مختلف ہے چونکہ اس کو دستوری حکومت اور انفرادی آزادی کی حمایت کرنی ہے اس لئے ابتدا ہی سے وہ ایک مختلف نظریہ پیش کرتا ہے۔ اس کا "فطری انسان"، بہت آسودہ حال، مطمئن اور آزاد ہے، "انفرادی آزادی اور ملکیت کا حق"، یہ خصوصیات اس دور کی ہیں جس پر سب انسان عمل پیرا ہیں۔ انہی دو خصوصیتوں کو باقی رکھنے کے لئے معاہدہ کی ضرورت پیش آئی۔ اس کے نزدیک یہ معاہدہ فطری زندگی سے بیزاری کا نتیجہ نہیں بلکہ اس کو قائم رکھنے

کی خواہش کا۔ افراد کی حیثیت خود مختار ریاستوں کی سی ہے جو اپنی آزادی کو قائم رکھتے ہوئے آپس میں ایک دوسرے کی حفاظت کے لئے معاہدہ کر لیتی ہیں۔

انفرادی آزادی کو تسلیم کرنے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ بادشاہ کو مطلق العنان تسلیم نہیں کرتا بلکہ وہ اسٹیٹ کو وقف سے تشبیہ دے کر بادشاہ کو صرف متولی کی حیثیت دیتا ہے۔ اس کے نزدیک مطلق العنانی کے تمام حقوق کی مالک پارلیمنٹ ہے۔

روسو (۱۷۱۲ء تا ۱۷۷۸ء) جو انقلاب فرانس کا خالق سمجھا جاتا ہے۔ فطرت اور تمدن کو آپس میں متضاد سمجھتا ہے۔ انسان آزاد ہے مگر تمدن اس کو غلام بنا دیتا ہے وہ اپنی کتاب "معاہدہ عمرانی" کو شروع ہی ان الفاظ سے کرتا ہے:۔

"انسان آزاد پیدا ہوا ہے مگر جدھر دیکھو وہ پابزنجیر ہے۔"

روسو انسان کو ہمیشہ آزاد دیکھنے کا متمنی ہے اور یہ آزادی افراد کی باہمی معاہدہ سے قائم رہ سکتی ہے جس میں ہر شخص ایک دوسرے کی آزادی کی حفاظت اپنے ذمہ لے لے چنانچہ وہ "معاہدۂ عمرانی" میں کہتا ہے: "مسئلہ یہ ہے کہ اجتماع کی کوئی ایسی شکل تلاش کی جائے جس میں قوت اجتماعی کے ذریعہ ہر شریک کی جان و مال کی حفاظت ہو سکے اور جس کی بنا پر گو ہر شخص "کل" میں شریک ہو تاہم وہ صرف اپنی تابعداری کرے اور اس کی وہی آزادی قائم رہے جو اُسے پہلے حاصل تھی"۔ اس مسئلہ کا حل اس کے خیال میں "معاہدہ عمرانی" ہے۔

روسو کا معاہدہ افراد کا باہمی معاہدہ ہے نہ کہ حاکم و محکوم کا اس کے نزدیک حاکمیت کے تمام اختیارات افراد یا جماعت ہی کے پاس ہیں نہ کہ کسی بادشاہ یا پارلیمنٹ کے پاس اس کے معاہدہ کا تخیل ان الفاظ میں مضمر ہے :-

"ہم میں سے ہر ایک مشترک طور پر اپنی ذات اور اپنی قوتوں (صلاحیتوں) کو ارادۂ اجتماعی کے حوالے کرتا ہے اور اس کے عوض ہم میں سے ہر فرد "کل" کا جزو لاینفک بن جاتا ہے"

(معاہدۂ عمرانی مترجمۂ ڈاکٹر محمود حسین خاں صاحب)

روسو کے "نظریۂ معاہدہ" میں "ارادۂ اجتماعی" کو خاص اہمیت حاصل ہے اس کے نزدیک جماعت اسی وقت تک آزاد ہے جب تک وہ صرف اپنے ضمیر کی آواز کے سامنے سر تسلیم خم کرتی ہے - وہ کہتا ہے کہ "قانون اس ارادۂ اجتماعی کے باقاعدہ اور علانیہ اظہار کا نام ہے جس قانون کو ارادۂ اجتماعی کا جواز حاصل نہ ہو وہ قانون کہلانے کا مستحق نہیں یہ حق صرف جماعت کو حاصل ہے کہ وہ اپنے لئے قانون وضع کر لے"

مسلم مفکرین میں ابونصر فارابی (۸۷۰ء تا ۹۵۰ء المطابق ۲۵۶ھ تا ۳۳۹ھ) تقریباً انہیں خیالات کو پیش کرتا ہے جن پر ایک ہزار برس بعد معاہدۂ عمرانی کی نظریے کی بنیاد پڑی - ہابس وغیرہ نے جن خیالات کا اظہار صدیوں بعد کیا فارابی ان کو بہت عرصہ قبل ظاہر کر چکا تھا - اس کے نزدیک اجتماع کا قیام نتیجہ ہے انسان کی جنگجو فطرت کا - وہ کہتا ہے کہ ابتداء میں طاقتور کمزور پر تشدد کرتا تھا - اس لئے آپس میں جھگڑے اور فسادات رونما ہوتے تھے - جب انسان اس

حالت سے تنگ آئے تو وہ ایک جگہ جمع ہوئے اور ہر شخص نے اپنی رضامندی سے اپنے حقوق کا ایک حصہ ایک مرکزی قوت کے سپرد کیا۔ اس طرح فارابی نظریۂ "ترک حقوق باہمی" (MUTUAL RENUNCIATION OF RIGHT) کا بانی ہے۔ فارابی اسٹیٹ کو یونانیوں کی طرح "شہر" (مدینہ) کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ فارابی اور ہابس کی نظریات میں یہ فرق ضرور ہے کہ ہابس افراد کی پسماندگی اور بیچارگی پر اسٹیٹ کی بنیاد رکھتا ہے اس کے نزدیک بیرونی دشمن کے خطرے سے محفوظ رہنے کے لئے منتشر افراد نے مل کر اپنے تمام اختیارات ایک شخص کو دے دیئے لیکن فارابی بیرونی حملے کو اجتماع کے قیام کا سبب قرار نہیں دیتا بلکہ باہمی تنازعات کو روکنے اور انصاف حاصل کرنے کے لئے اس معاشرہ کو ضروری سمجھتا ہے۔

امام غزالی (۱۰۵۵ء تا ۱۱۱۱ء المطابق ۴۴۷ھ تا ۵۰۵ھ) اسٹیٹ کے مصنوعی تخیل کے خلاف ہیں وہ اس کو فطری ارتقار کا نتیجہ خیال کرتے ہیں۔ احیاء العلوم میں وہ اپنی رائے کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:۔

> "انسان مجبور ہے کہ اپنے ہی جیسے دوسرے انسان کی معیت اختیار کرے اول تو اپنی تفریح کے لئے وہ دوسرے انسان (جنس مخالف) کے ساتھ رہنے اور مجامعت وغیرہ کا طبعی میلان رکھتا ہے پھر اپنی ضروریات زندگی کو پورا کرنے کے لئے ایک دوسرے کا محتاج ہے لیکن انسان کے باہمی معاملات دنیوی کا بخیر و خوبی انجام پانا ناممکن ہے بغیر کسی حاکم یا سلطان کے۔ کیونکہ کاشتکار زمیندار تاجر، سپاہی،

مزدور اور محتاج اپنے معاملات خود طے نہیں کر سکتے۔ جب شہروں اور قصبوں کی بنیاد پڑتی ہے تو بغیر کسی حاکم کے باہمی نزاعات کا رونما ہونا لازمی ہے۔ اگر ہر شخص اپنے معاملات کو خود طے کرنے لگے تو کوئی کسی کے آلام کا ذمہ دار نہیں ہو سکتا ہے۔ ان حالات میں باہمی زندگی بسر کرنے کے اصول وغیرہ اور ایک دوسرے کے اختیارات پر حدود خود بخود پیدا ہوتے ہیں۔ اور یہی نظام ترقی کر کے ریاست کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔"

علامہ ابن خلدون کے نزدیک "مجتمع" کا سبب حفاظت نفس کا فطری جذبہ ہے۔ ابن خلدون بھی ہابس کے برخلاف سلامتی اور امن کی ضرورت پر "مجتمع" کی بنیاد رکھتا ہے۔ چنانچہ اپنے مقدمہ حصہ دوم ص۳۹ پر لکھتا ہے:۔

"ملک وسلطنت نوع انسانی کا طبعی خاصہ ہے۔ کیونکہ انسانی حیات و وجود بغیر اس کے ممکن ہی نہیں کہ آدمی مل جل کر رہیں اور حصول معاش اور ضروریات میں ایک دوسرے کی مدد کریں اور جمع ہونے پر باہمی معاشرت و معاملہ کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اور ہر شخص حیوانی طبیعت کے مقتضاء ظلم و عدوان کی وجہ سے دوسروں کے حقوق پر دست اندازی کرتا ہے اور وہ غضب و نفرت کی وجہ سے کہ اقتضائے بشریت ہے۔ انہیں روکتے اور درپے مدافعت ہوتے ہیں اور نزاع شروع ہو کر جدال و قتال تک نوبت پہنچتی ہے اور انجام کار ہرج مرج اور خونریزی و اتلاف نفوس کا بازار گرم ہو جاتا ہے جس سے انقطاع

نوعی کا قوی احتمال ہے حالانکہ حفظ نوعی از روئے مشیت ضروری ہے
پس چونکہ فیصلہ کن حاکم کے بغیر انسان کی بقاء اور حفاظت محال
ہے۔اس لئے انہیں حاکمِ عادل کی ضرورت پڑتی ہے کہ ایک دوسرے
پر ظلم نہ کرنے دے۔یہی شخص فطرتِ بشری کے اقتضاء کے موافق
ملک قاہر اور سلطان مستحکم بنتا ہے"

مسلم مفکرین کی اکثریت اجتماع کو اقتضائے فطرت انسانی کا نتیجہ قرار دیتی ہے۔ ان کے نزدیک فطرت اور تمدن دو متضاد چیزیں نہیں ہیں بلکہ تمدن و معاشرت اور تنظیم کے رجحانات انسان میں فطری ہیں۔اسٹیٹ کا قیام بھی انہی فطری رجحانات کا نتیجہ ہے اسی لئے اسلام نے ہر عہد میں جماعتی زندگی پر زور دیا ہے۔ جماعت "دین"، کا اہم ترین جزو ہے جو انسان کی انفرادی صلاحیتوں کو جو فطرت کی طرف سے اس میں ودیعت کی گئی ہیں بروئے کار لانے اور ترقی دینے کا بہترین ذریعہ ہے اسلام کے نزدیک ہر انسان فطری طور سے آزاد ہے۔سوائے خدا کی غلامی کے وہ کسی طاقت کا غلام نہیں۔ اور جماعتی زندگی اس آزادی کو برقرار رکھنے کا ایک ذریعہ ہے۔ لیکن یہ جماعتی زندگی افراد کے کسی خود ساختہ معاہدہ کا نتیجہ نہیں ہے جس کو انہوں نے بغیر کسی ہدایت کے خود ایک جگہ بیٹھ کر مرتب کر لیا ہو اور نہ اس جماعتی زندگی کا قانون کسی ارادۂ اجتماعی کا نتیجہ ہے بلکہ اسلام میں فرائض و قوانین انفرادی و اجتماعی انبیاء کے ذریعہ خود خدا کے مقرر کردہ ہیں۔ انسانوں کو غلامی سے محفوظ رکھنے اور غیر فطری زندگی کی گمراہی سے بچانے کے لئے انسانوں پر وحی الٰہی کا سلسلہ جاری کیا گیا تاکہ انبیاء ان کو انسانی نصب العین سے

قریب رکھیں اسلام میں حاکم و محکوم کی حیثیت سے اگر کوئی معاہدہ ہے تو وہ خدا اور بندوں کے درمیان ہے۔ رسُول کے ہاتھ پر ایمان لانے والوں کا بیعت کرنا بے شک ایک "عہد و پیمان" ہے اور اس معاہدہ کا مقصد دین یا اسٹیٹ کا قیام بھی ہے لیکن رسول اور مومنین کی جماعت کا یہ معاہدہ بھی دراصل خدا اور بندوں کے درمیان ہے۔ رسُول کی حیثیت اس معاہدہ میں "نمایندۂ خدا" کی ہے جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے:-

"بے شک وہ لوگ جو تجھ سے (اے پیغمبر) بیعت کر رہے ہیں وہ (گویا) خدا سے بیعت کر رہے ہیں اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے۔ پھر جو کوئی (اپنا اقرار) توڑے وہ اقرار توڑ کر اپنا نقصان کرے گا۔ اور جو کوئی اس اقرار کو پورا کرے جو اُس نے اللہ کے ساتھ باندھا اس کو اللہ بڑا اجر دے گا" (الفتح ۱۰)

اس معاہدہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں محکوم اپنے اقتدار اعلیٰ کے سامنے خود کو کلیتہً سپرد کر دیتا ہے اور اسی کی اطاعت کو اپنا نصب العین قرار دے لیتا ہے۔ افراد کی طرف سے حاکم اعلیٰ (خدا) یا اس کے نمایندے (رسول) پر کوئی پابندی عائد نہیں ہوتی۔ اس لئے یہ معاہدہ جس پر اسلامی اسٹیٹ کی بنیاد قائم ہے "معاہدہ عمرانی" کی قسم کا معاہدہ نہیں بلکہ یہ ایک "عہد اطاعت" ہے جو افراد اپنے حاکم اعلیٰ کے نمایندے کے سامنے کرتے ہیں۔

انبیاء کے بعد خلفاء کے ہاتھ پر جو بیعت اطاعت کی جاتی ہے وہ بھی اگرچہ اسی معاہدہ کے سلسلے کی ایک کڑی ہے لیکن اس میں خلیفہ خود معہ ولی

افراد کی طرح ایک فرد ہے اس لئے افراد کو اس کے اوپر پابندیاں عائد کرنے کا حق ہے یہ پابندیاں وہی ہوں گی جو حاکم اعلیٰ نے پہلے سے مقرر کر دی ہیں اس کو ہم افراد کا ایک باہمی معاہدہ یا فارابی کے الفاظ میں "معاہدہ ترک حقوق" MUTUAL RENUNCIATION OF RIGHTS کہہ سکتے ہیں لیکن یہ واضح ہے کہ یہ معاہدہ اسٹیٹ کے قیام کے لئے نہیں بلکہ قائم شدہ اسٹیٹ کو چلانے کیلئے ہے۔

جہاں تک اس معاہدہ عمرانی کا تعلق ہے جس کو مغربی مفکرین نے اسٹیٹ کے قیام کی بنیاد قرار دے رکھا ہے تاریخ کسی ایسے معاہدے سے واقف نہیں۔ دنیا کے کسی حصے میں کبھی ایسا کوئی واقعہ تاریخ میں موجود نہیں جس سے ثابت ہو سکے کہ منتشر افراد نے ایک جگہ جمع ہو کر کوئی معاہدہ کر کے اسٹیٹ کو قائم کیا ہو۔ بے شک کسی بغاوت کے بعد افراد کا ایک جگہ جمع ہونا اور کسی دستور کا تیار کرنا بالکل نیچرل ہے جیسا کہ انقلاب فرانس کے بعد ہوا۔

علاوہ اس کے اسٹیٹ کے قیام کا ہر جگہ ایک ہی سبب نہیں ہو سکتا جیسا کہ "معاہدہ عمرانی" کے مصنفین نے اپنے اپنے خیال کے مطابق قائم کر رکھا ہے۔ ہابس، لاک اور روسو میں سے ہر ایک نے علیحدہ علیحدہ حالات کا مطالعہ کیا اور صرف اپنے ہی معاہدے کو عمومی حیثیت سے اسٹیٹ کے قیام کا سبب دے دیا حالانکہ ہر عہد میں مختلف اسباب کارفرما رہے۔ تاریخ میں بے شمار مثالیں ایسی موجود ہیں جن سے ثابت ہے کہ ایک ڈاکو نے کسی جماعت کی بنیاد ڈالی اور وہی ترقی کر کے سلطنت بن گئی۔ بعض مقامات پر قبائلی تنظیم نے ترقی کر کے اسٹیٹ کی شکل اختیار کر لی۔

خلافت و ملوکیت

جیسا کہ پیشتر واضح کیا جا چکا ہے بارِ خلافت کی امین پوری ملتِ اسلامیہ ہے نہ کہ ایک فردِ واحد ملت ہی خلیفہ کو منتخب کر سکتی ہے۔ اور وہی معزول کر سکتی ہے۔ ملت کا ہر فرد نظامِ خلافت میں ایک مساوی رکن ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ خلیفہ عام مسلمانوں پر کوئی ترجیح یا فوقیت نہیں رکھتا وہ مطلق العنان آمر کی حیثیت کبھی اختیار نہیں کر سکتا۔ خلافت کی بنیاد ہی "شوریٰ بینھم" پر ہے۔ نظامِ خلافت کی خصوصیت یہ ہو کہ خلیفہ کو عام طور پر قانون سازی کا کوئی حق نہیں ہے۔

اسلامی نظامِ حکومت میں امیر یا خلیفہ بھی قانونِ حکومت کا اسی طرح پابند و محکوم ہے جس طرح اسٹیٹ کا ایک معمولی فرد۔ بادشاہ کے منزہ عن الخطا (KING CAN DO NO WRONG) کا نظریہ اسلام میں بالکل مفقود ہے یہاں خلیفہ کو دیوانی اور فوجداری قوانین کی پابندی عام افراد کی طرح کرنا ہوگی اور عدالت میں بھی اس کو عوام کی طرح حاضر ہونا ہوگا۔

یہ حقیقت کہ احکام و قوانین کا سرچشمہ ذاتِ الٰہی ہے۔ قریب قریب ہر عہد میں انبیاء کرام کی تعلیمات میں شامل رہی ہے۔ بنی اسرائیل کی حکومت میں یہی عقیدہ عرصۂ دراز تک کارفرما رہا۔ ان کے نزدیک "قیامِ سلطنت خداوند تعالیٰ کا بلاواسطہ فعل یعنی زمین پر خدائی حکومت کا بلاواسطہ ظہور تھا"۔ لیکن امتدادِ زمانہ کے ساتھ یہ تعلیمات اپنی اصلی حقیقت سے دور ہوتی گئیں۔

اہلِ یونان و روم کے اندر حکومت ربانی کا جو تخیل ملتا ہے وہ اسی تعلیم کی بگڑی ہوئی شکل تھی۔ وہ سلطنت کو خدا کا بالواسطہ فعل تصور کرتے تھے۔

یونانی قوانین میں ڈلفی اور دوسرے چند مقامات کے مندروں کے پجاریوں کو بہت دخل تھا جن کے تعلق عام طور سے یہ عقیدہ تھا کہ وہ دیوتاؤں سے مشورہ کر کے قانونی ہدایتیں دیتے ہیں لہذا عام افراد اور ریاستوں کے نمائندے قانون بناتے وقت ان پجاریوں سے ہدایت حاصل کرتے تھے۔ افلاطون اگرچہ قانون کو عام رسم و رواج قبائل میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کا نتیجہ سمجھتا ہے لیکن وہ بھی کسی قانون کی تبدیلی کو جائز نہیں سمجھتا جب تک تمام حاکم اور اور شہریوں کے ساتھ مندروں کی غیبی آوازیں بھی شریک نہ ہوں (نوامیس)

رومن قوانین حکومت میں دعا اور قربانیوں کو بہت دخل تھا۔ یہاں تک کہ عدالت کی کارروائیوں اور تخت نشینی کی رسوم میں بھی دیوتاؤں کی عبادت برابر شامل تھی۔ ان کے قانون عالیہ میں طیور سے شگون لینے کا رواج عام طور سے جاری تھا۔ جس سے وہ دیوتاؤں کی مرضی معلوم کرتے تھے۔ عیسائیت کے ظہور کے بعد اس عقیدے نے پھر ایک نئی شکل اختیار کی۔ چنانچہ پادکوس اپنے تیرھویں خط میں رومیوں کو اس طرح خطاب کرتا ہے "ہر شخص کو اس کے تابع ہونا چاہیئے جس کا اقتدار اس پر ہے کیونکہ کوئی حاکم نہیں مگر خدا کیطرف سے اور اگر کوئی حاکم ہے تو وہ خدا ہی کے حکم سے ہے"

اسی طرح پلوٹارک کا یہ جملہ کہ "ایک شہر کا بلا زمین کے قائم کر لینا اس سے آسان ہے کہ خدا پر اعتقاد رکھے بغیر سلطنت قائم کر لی جائے"

عیسائی دنیا میں حکومت ربانی کے تخیل نے بہت جلد ایک عجیب شکل اختیار کر لی۔ پہلے پوپ نے اپنے لئے احکام کے نفاذ کے "حق الٰہی"

کا دعویٰ کیا اور بجائے قوانین آلٰہیہ کو حکومت کا DIVINE RIGHTS نصب العین بنانے کے خود اپنے بنائے ہوئے اوامر و قوانین کو خدائی قوانین سے تعبیر کیا کیونکہ وہ اپنے آپ کو خدا کا نائب سمجھتے تھے لہٰذا وہ جس قسم کے احکام چاہتے نافذ کرتے اور ان کو قوانین آلٰہیہ DIVINE LAWS سے تعبیر کرتے جب سلطنت نے چرچ کا مقابلہ کیا تو بادشاہوں نے انہی آلٰہی حقوق کا دعویٰ اپنی ذات کے لئے کر دیا اس طرح حکومت ربانی کا تخیل بالکل مسخ ہو گیا اس کی بجائے انسان کا استبداد مذہبی حکومت کے لباس میں نمودار ہو گیا۔ جو دنیوی حکومت کے استبداد سے بھی کہیں زیادہ مضر ثابت ہؤا۔

مصر کی قدیم تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں ابتداء میں حکومت کو براہ راست دیوتاؤں سے متعلق سمجھا جاتا تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد انسان حکومت کرنے لگے لیکن ان کو خدا کی اولاد سمجھا جانے لگا اور ایک خاص قسم کا تقدس ان کی ذات سے وابستہ ہو گیا۔ عجب نہیں کہ فرعون کا دعویٰ خدائی اسی تقدس کا نتیجہ ہو۔ بالعموم اس زمانے میں بادشاہ کو مربّی اور خدا کا خاص بندہ سمجھا جاتا تھا۔ عیسائی دنیا میں بھی قدیم تخیل اسی طرح مختلف شکل میں نمودار ہؤا اور پوپ اور بادشاہوں نے علیحدہ علیحدہ اپنے تقدس کا نقشہ جمانا شروع کیا۔

لڈوگ شاہ بویریا کے " نظام سلطنت " ۱۳۳۶ء کا یہ جملہ اس حقیقت کا آئینہ دار ہے ۔ " جو حکمرانی کے جلال اور اقتدار والا مان لیا گیا ہے وہ بلا واسطہ محض خدا کی طرف سے ہے " اسی طرح لوئس چہاردہم کا یہ فقرہ کہ " ہم بادشاہ اس ذات کی زندہ تصویریں ہیں " اور " جس ذات نے انسانوں پر بادشاہ

مسلّط کئے ہیں اس کا منشا یہ ہے کہ بادشاہ کا احترام اس کے نائب کی حیثیت سے کیا جائے۔ صرف یہ اختیار ذات باری تعالیٰ نے اپنے لئے رکھا ہے کہ حکمرانوں کی فعل اور ترک فعل پر محاسبہ کرے جو رعایا کی حیثیت سے پیدا ہوا ہے۔ اس کو بے چون وچرا اطاعت کرنا چاہیئے یہی ہے مشیت الٰہی"۔

اسٹال اپنی کتاب "نظریۂ سلطنت" کی دوسری اشاعت میں لکھتا ہے کہ:-

"ازمنۂ وسطیٰ کے نظری تصوّر کے موافق عالم عیسوی کے سردار خود خدا کے قائم مقام ہیں۔ اس لئے جملہ حکمران (پوپ شہنشاہ، بادشاہ) اپنی ذات میں خدا کی طرف سے پورے اختیارات رکھتے ہیں"۔

اسی کتاب میں دوسری جگہ وہ کہتا ہے:-

"سلطنت کا اقتدار خدا کا اقتدار ہے نہ صرف اس معنی میں کہ تمام حقوق مثلاً ملکیت، ازدواج، اقتدار پدری سب خدا کے حقوق ہیں اور وہی اس کو چلاتا ہے۔ سلطنت صرف اسی بنا پہ حکمرانی نہیں کرتی کہ خدا نے اُسے اقتدار دے رکھا ہے۔ جیسے باپ بچوں پر حکمرانی کرتا ہے بلکہ وہ خدا کی طرف سے حکمرانی کرتی ہے اور یہی باعث سلطنت کے نشانِ عظمت کا ہے"۔

(ماخوذ از "نظریۂ سلطنت"، از ڈاکٹر جے کے منچلی ترجمہ قاضی تلمذ حسین جامعۂ عثمانیہ)

جدید مفکرین میں روسو اس بات کو بہت واضح طور سے بیان کرتا ہے کہ انسان خود اپنا قانون بنانے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ وہ سوال کرتا ہے کہ "نا سمجھ انسانوں کا ایک انبوہ جسے خود یہ پتہ نہ ہوگا اس کے لئے کس چیز میں

بہتر ہی ہے اپنے لئے قانون سازی کا اس قدر مشکل اور عظیم الشان کام کیونکر انجام دے سکتا ہے؟ لوگ اپنی فلاح و بہبود کے خواہاں تو ہوتے ہیں مگر انہیں خود ہمیشہ نہیں معلوم ہوتا کہ ان کی فلاح کا ہے میں ہے"۔ اس کا جواب وہ اس طرح دیتا ہے:۔

"یہ پتہ چلانے کے لئے کہ قوموں کے واسطے سب سے زیادہ موزوں معاشرتی قوانین کون سے ہیں ضرورت ہے بالا و برتر ذہن کی جو انسانوں کے تمام جذبات و احساسات کا مشاہدہ کرے۔ جو ایک صدی میں کوئی کام انجام دے اور اس کا پھل اسے دوسری صدی میں ملے۔ انسانوں کے واسطے قوانین مرتب کرنے کے لئے خلائی ہستی درکار ہے"۔

اس خلائی ہستی کا ذکر وہ اس طرح کرتا ہے:۔

"قانون ساز ہر اعتبار سے ریاست میں دوسروں سے ممتاز ہوتا ہے اس میں اور انسانی حکومت میں کوئی چیز مشترک نہیں اس لئے کہ اس کے قبضے میں جو انسانوں کا حاکم ہے۔ قانون سازی نہ ہونی چاہیئے تو پھر جسے قانون سازی کا حق ہو اسے انسانوں پر حکومت کا حق نہ ہونا چاہیئے۔ ورنہ اس کے قوانین جو اس کے محسوسات کا نتیجہ ہوں گے اکثر اس کے غیر منصفانہ اعمال کو دوام بخشا کریں گے وہ کبھی اس کا سد باب نہ کر سکے گا کہ انفرادی مفاد اس کے پاک کام کو خراب نہ کر پائے۔ جب ڈی کرگس نے اپنے ملک کے لئے

قوانین وضع کئے تو پہلا کام یہ کیا کہ تخت سے دست بردار ہوا۔
یونان کے اکثر شہروں کا یہ قاعدہ تھا کہ وہ اپنے قوانین باہر والوں
سے وضع کراتے تھے۔ اطالیہ کی جدید جمہوریتیں بھی اکثر یہی کرتی
تھیں۔ جینوا کی ریاست بھی یہی کرتی تھی۔" (معاہدہ عمرانی ص۹۳ تا ۹۹)

قوانین بنانے کے لئے وہ صرف برحق رسول کی ہستی کو اس کا اہل سمجھتا ہے
اس کے خیال میں وہ جھوٹے دعویدار پیغمبری جو کچھ شعبدے دکھا کر احمقوں کی ایک
جماعت کو اپنا معتقد بنا لیتے ہیں۔ کسی سلطنت کی بنیاد نہیں ڈال سکتے۔ وہ کہتا
ہے "قانون اسرائیلی جواب تک زندہ ہے اور قانون ابن اسمٰعیل جو دس صدیوں
سے آدھی دنیا پر چھایا ہوا ہے دونوں آج بھی اس کے شاہد ہیں کہ وہ کیسی عظیم الشان
ہستیاں تھیں جنھوں نے یہ قوانین وضع کئے" لیکن ہماری حیرت کی کوئی حد
نہیں رہتی جب ہم دیکھتے ہیں کہ روسو خدائی قوانین پر دل سے اعتقاد نہیں رکھتا
بلکہ وہ مصلحتاً مذہب کو اس لئے آلۂ کار بنانا چاہتا ہے تاکہ عوام اسٹیٹ کے قانون
کو خدائی قانون سمجھ کر بے چون وچرا قبول کر لیں چنانچہ وہ کہتا ہے:۔

" واربرٹن (۱۶۹۸ء تا ۱۷۷۹ء) سے متفق ہو کر ہمیں یہ نتیجہ
نہیں نکالنا چاہیئے کہ ہمارے یہاں سیاست اور مذہب دونوں
کی ایک ہی غرض و غایت ہے۔ ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ قوموں
کی ابتدائی زندگی میں مذہب کو سیاسی اغراض کے لئے استعمال
کیا جا سکتا ہے"

(معاہدۂ عمرانی مترجمہ ڈاکٹر محمود حسین خان ص۹۹)

اسلام کے نزدیک حکم و آئین صرف اللہ کے لئے مخصوص ہے۔ خلیفہ یا جماعت اسلامی نہ خود کوئی قانون بنا سکتی ہے نہ کسی موجودہ قانون کو تبدیل کر سکتی ہے۔ وہ صرف ان قوانین و احکام کو جو خدا کی طرف سے رسول کے ذریعہ انسانوں پہ عائد کئے گئے ہیں نافذ کر سکتی ہے۔ البتہ جہاں قرآن کریم کا کوئی صریح حکم موجود نہیں ہے اس کو اجتہاد کا حق ہے۔ یعنی قرآن و سنت کی روشنی میں جزوی مسائل کیلئے وہ فروعی احکام BY LAWS مجلس شوریٰ کے مشورے کے ساتھ بنا سکتا ہے۔ اسی طرح خلافت کی آمدنی، نظام بیت المال، اسٹیٹ کی زمین اور مال پہ اسکا کوئی ذاتی حق نہیں ہے۔ آئین کی طرح ملکِ زمین بھی صرف اللہ کے لئے مخصوص ہے (الارض للہ) وہ اپنے ذاتی اور خاندانی اخراجات کے لئے بیت المال سے اس قدر لے سکتا ہے جتنا ایک عمدہ اور ستھری زندگی بسر کرنے کے لئے ایک معمولی خاندان کے لئے ضروری ہے۔ ملک و حکومت میں اس کی وہی پوزیشن ہے جو ایک متولی کی وقف میں۔ ملت کے پورے سرمائے کا وہ امین ہے۔ اس میں بیجا تصرف سب سے بڑا جرم ہے، نہ خلیفہ کے بعد خلافت اس کے ذاتی وارث کو ورثے میں پہنچ سکتی ہے۔

حضرت عمرؓ کی ایک تقریر کے مندرجہ ذیل جملے خلیفۂ اسلام کی صحیح پوزیشن کو واضح کر دیتے ہیں:۔

> "مجھ کو تمہارے مال (یعنی بیت المال) میں اسقدر حق ہے جتنا یتیم کے مربّی کو یتیم کے مال میں۔ اگر میں دولت مند ہوں گا تو کچھ نہ لوں گا اور اگر ضرورت پڑے گی تو دستور کے مطابق کھانے کے لئے لے لونگا۔"

میرے اوپر تم لوگوں کے متعدد متعدد حقوق ہیں جن کا تم کو مجھ سے مواخذہ کرنا چاہئے۔ ایک یہ کہ ملک کا خراج اور یہ مال غنیمت بیجا طور سے جمع نہ کیا جائے ایک یہ کہ جب میرے ہاتھ میں خراج اور مال غنیمت آئے تو بیجا طور سے صرف نہ ہونے پائے۔" (الفاروق صفحہ)

پس دستور "خلافت اسلامی" کا بنیادی اصول PRE-AMBLE ہی یہ ہے کہ حکم و آئین اور ملک و زمین میں کوئی انسانی اختیار کارفرما نہ ہو۔ یہ خدا کے خاص حقوق PREROGATIVES ہیں۔

برخلاف اس کے ملوکیت اس نظام حکومت کا نام ہے جس میں تمام سلطنت کی آمدنی۔ خزانے۔ ملک و جائداد بادشاہ کی ملک خاص سمجھے جاتے ہیں وہ جس طرح چاہے انہیں صرف کر سکتا ہے۔ اس کی سلطنت میں رہنے والے تمام انسان اس کی رعایا ہیں۔ وہی قانون و انصاف کا سرچشمہ اور زمین پر خدا کا اوتار ہے اس کا حکم آخری ہے جس کی کوئی اپیل نہیں۔ غرضیکہ "ربوبیت" کی بیشتر خصوصیات بادشاہت کے اس تخیل میں پنہاں ہیں۔ ان اختیارات کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اس کے جانشینوں کو منتخب کرنے کا کوئی حق دوسرے انسانوں کو نہیں پہنچتا بلکہ ملک جائداد کی طرح حکومت و سلطنت بھی اس کے وارثوں کو پہنچتی رہتی ہے۔ حقیقت میں حکومت کا وراثتاً یکے بعد دیگرے ایک ہی خاندان کے افراد میں منتقل ہوتے رہنا ہی ملوکیت کی بنیاد ہے۔ کیونکہ زمین و حکومت بادشاہ کی ذاتی ملک ہے نہ کہ امانت قوم جیسا کہ علامہ اقبال نے فرمایا ہے۔

ابلہ می گوئی متاع مال ماست مرد ناداں ایں ہمہ ملک خداست

ارضِ حق للارض خود دانی بگو — چیست شرحِ آیۂ لا تُفسِدوا
پس امارت را بکارِ خود نہ بود — اے خوش آں کو ملکِ حق با حق سپرد
ملکِ یزداں را بہ یزداں باز دہ — تا ز کارِ خویش بکشائی گرہ
زیرِ گردوں فقر و مسکینی چراست — آنچہ از مولاست می گوید زماست

افلاطون نے اپنی تصنیف "ریاست" میں تھریسی میکس کو خطاب کرتے ہوئے ملوکیت کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ بالکل حقیقت پر مبنی ہیں، وہ لکھتا ہے :-

"میں آپ کو اس عظیم الشان ظلم اور ناانصافی کی مثال دیتا ہوں جسے حکومت شخصی کے نام سے موسوم کرتے ہیں جس میں سب سے بڑا مجرم سب سے زیادہ خوش نصیب انسان ہوتا ہے۔ اور مظلومین کی حالت ناگفتہ بہ جس میں جبر و تعدی، دجل و فریب سے دوسروں کی جائدادیں رفتہ رفتہ نہیں بلکہ یک لخت ضبط کر لی جاتی ہیں اور تمام چیزیں اچھی ہوں یا بری مقدس ہوں یا نجس، شخصی ملک ہوں یا جماعتی سب کی سب ایک آدمی کے پاس پہنچ جاتی ہیں۔ اگر کوئی انسان ان میں سے ایک کا مرتکب ہو تو اس کو سخت سے سخت سزا دیجائے۔ اور اس کی بیحد تذلیل ہو، لوگ ایسے قزاق، چور، بدمعاش اور جعلساز کہیں لیکن جب یہی شخص اپنی رعایا کے مال کو غصب کرنے کے علاوہ خود ان کی ذات کو اپنا غلام بنا لیتا ہے تو بجائے برا کہنے کے ہر شخص جو اس کے حالات سنتا ہے حتیٰ کہ خود اس کی مظلوم رعایا تک اُسے

مبارک ترین انسان تصوّر کرتی ہے اور یہ صرف اس لئے کہ اسنے بے ایمانی اور ظلم کو آخری درجے تک پہنچا دیا ہے۔"

ملوکیت کا یہ نظام اتنا ہی پرانا ہے جتنا انفرادی ملک کے حصول کا جذبہ۔ قدیم قبائلی تنظیم میں ہم دیکھ چکے ہیں۔کہ اس میں خاندان کے سب سے بڑے آدمی کو وہی اختیار حاصل تھے جو بادشاہ کو سلطنت میں۔ وہ افراد خاندان کی تمام آمدنی اور جائداد پر اختیار تصرف رکھتا تھا۔ جب یہ قبائلی تنظیم ترقی کر کے سلطنت میں تبدیل ہوئی تو خاندان کے معمر ترین مرد کے حاکم ہونے کا رواج برابر باقی رہا۔ اکثر ممالک میں ابتدار قیام سلطنت میں یہی رواج جاری رہا۔ چنانچہ خاندانی وراثت کی یہ رسم روس میں سترھویں صدی تک جاری رہی۔

سلطان محمد ساوس تک ترکوں میں یہ رسم قائم رہی۔ جمعیت عالیہ ملیہ انگورہ نے حکومت جمہوریہ کی بنیاد قائم کرتے وقت اس رسم کو مٹایا۔

ان ممالک میں جہاں سلطنت کسی بہادر فاتح جنرل کی فتوحات کا نتیجہ تھی وہ اس لیئے اس کی ذاتی ملک سمجھی گئی کہ اس کو اس کی تلوار نے سر کیا تھا۔ چونکہ بقول پروفیسر جنکس "ہر آدمی کم از کم اس بات کا خواہاں ہوتا ہے کہ اپنی اولاد کیلئے بڑا منصب چھوڑ جائے۔ چنانچہ قدیم بادشاہوں کی تمام قوتیں اسی مقصد کی تکمیل میں صرف ہوتی تھیں" اس لئے ابتدائی زمانۂ قیام سلطنت ہی سے خاندانی وراثت کا رواج شروع ہوگیا۔ ازمنۂ قدیم کی تاریخ سے بہت واضح طور سے معلوم ہوتا ہے کہ ملوکیت کا یہ نظام اسی وقت سے جاری ہے جب سے تاریخ عالم وجود میں آئی۔

قدیم مصر میں فراعنہ تمام زمین و جائداد سلطنت کے مالک سمجھے جاتے تھے، اور عام افراد کو صرف عارضی انتفاع کا حق حاصل تھا۔

رومن شہنشاہی میں تمام مملکت کی زمین بادشاہ کی ملک سمجھی جاتی تھی۔ اسی طرح ازمنۂ وسطیٰ میں یورپ کے اکثر مقامات مثلاً انگلستان میں بادشاہ تمام زمین کا مالک سمجھا جاتا تھا اور رعایا کا اپنی جائدادوں پر قبضہ بطور جاگیردار کے ہوتا تھا جس کا عطا کرنا یا واپس لے لینا بادشاہ کے رحم و کرم پر منحصر تھا۔

زمانہ جدید میں جبکہ شہنشاہیت کے اختیار بڑی حد تک محدود ہو گئے ہیں، بادشاہ کی ملک کو اس کے حقوق فرمانروائی سے کافی ممیز کر دیا گیا ہے اور انفرادی حقوق ملکیت کو تسلیم کیا جانے لگا ہے۔ ملک کو ایک شخصی قانون کے معاملے اور فرمانروائی کو ایک سیاسی شے سے تعبیر کیا جاتا ہے جس کا تعلق صرف سلطنت سے ہوتا ہے۔ لیکن درحقیقت عہد جدید میں ملوکیت مختلف لباسوں میں اسی طرح کارفرما ہے جس طرح فراعنۂ مصر یا رومن ایمپائر کے عہد میں۔ اوڈورڈ جنکس کی یہ رائے بالکل صحیح ہے کہ "اگرچہ اب وراثۃً تخت نشینی کا سلسلہ اکثر ممالک میں شکست ہو گیا ہے۔ لیکن وہ حالت جو بانیانِ مملکت نے قائم کی تھی ابتک چلی آتی ہے۔ گو نام دوسرے پڑ گئے ہیں "شاہی" غالباً سیاست کا کامیاب ترین ادارہ ہے"۔

اس قسم کی ملوکیت اسلام میں مطلق ناجائز اور ناقابل تسلیم ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن کریم میں بادشاہت کا ذکر موجود ہے بالخصوص حضرت سلیمان علیہ السلام کے سلسلہ میں، آپ نے اپنے لئے ایسی بادشاہت کی دعا مانگی

ہے جیسی ان کے بعد کسی کو نہ ملے۔ رَبِّ ھَبْ لِیْ مُلْکاً لَّا یَنْبَغِیْ لِاَحَدٍ مِّنْ بَعْدِیْ
لیکن یہ بادشاہت وہی تھی جس کو حضرت عیسیٰ نے "آسمانی بادشاہت" کے نام سے موسوم کیا ہے، جس کا منشائے وحید دفع باطل اور قیام حق ہے نہ کہ اپنے خاندان میں ملوکیت و شہنشاہیت کو برقرار رکھنا۔ نہ قرآن کریم سے یہ کہیں ثابت ہے کہ وہ سلطنت کی تمام زمین کو اپنی ذاتی ملک سمجھتے تھے۔

یہ واضح رہے کہ ایک خلیفہ کے بعد اس کی اولاد میں سے کسی کا اس کا جانشین ہونا بذات خود ممنوع نہیں ہے۔ بشرطیکہ یہ عمل خالصتاً لوجہ اللہ ہو۔ اور عوام نے اپنی رضامندی سے ایسی جانشینی پہ مہر تصدیق ثبت کر دی ہو جو چیز اصول اسلامی سے بغاوت کے مترادف ہے وہ خلافت کو اپنی اولاد میں صرف اس لئے منتقل کرنا ہے کہ بادشاہت کی طرح خلافت ایک ہی خاندان میں مرکوز ہو جائے۔ علاوہ ازیں ایسا کرنا "شوریٰ بَیْنَھُمْ" کے بھی خلاف ہے کیونکہ خلافت کے وراثتاً منتقل ہونے کی شکل میں عوام کو انتخاب خلیفہ کا کوئی حق باقی ہی نہیں رہتا۔

حضرت عمرؓ نے فتح قادسیہ کی خبر سن کر مسجد نبوی میں جو تقریر فرمائی تھی اس کا آخری حصہ جو مندرجہ ذیل ہے خلافت و بادشاہت کے فرق کو واضح کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا:—

> "بھائیو! میں بادشاہ نہیں ہوں، کہ تم کو اپنا غلام بنانا چاہوں۔ میں تو خود اللہ تعالےٰ کا غلام ہوں۔ البتہ خلافت کا کام میرے سپرد ہے۔ اگر میں یہ کام اس طرح انجام دوں۔ کہ تم آرام سے اپنے گھروں میں اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کرو تو یہ میری خوش نصیبی ہے۔

اور اگر خدانخواستہ میری یہ خواہش ہو کہ تم لوگ میرے دروازے پر حاضری
دیا کرو تو یہ میری بدبختی ہوگی۔ میں تم کو تعلیم دیتا ہوں اور نصیحت
کرتا ہوں لیکن صرف قول سے نہیں بلکہ عمل سے بھی"

اسی طرح حضرت معاذ بن جبل کی تقریر کا مندرجہ ذیل حصّہ جو آپ نے ۱۷ھ
(۶۳۸ء) میں رومیوں کے فوجی دربار میں کی تھی اسلامی خلافت کا صحیح خاکہ ہے:

"تم کو اس پر ناز ہے کہ تم ایسے شہنشاہ کی رعایا ہو جس کو تمہاری
جان و مال کا اختیار ہے۔ لیکن ہم نے جس کو اپنا بادشاہ بنا رکھا ہے
وہ کسی بات میں اپنے آپ کو ترجیح نہیں دے سکتا۔ اگر وہ زنا کرے
تو اس کو دُرّے لگائے جائیں، چوری کرے تو ہاتھ کاٹ ڈالے
جائیں۔ وہ پردے میں نہیں بیٹھتا۔ اپنے آپ کو ہم سے بڑا
نہیں سمجھتا۔ مال و دولت میں اس کو ہم پر کوئی ترجیح نہیں"

افلاطون اپنی کتاب "ریاست" میں اپنے تصوّری بادشاہ کی جو صفات
بیان کرتا ہے وہ اس قابل ہیں کہ ان کو اس جگہ نقل کر دیا جائے۔ وہ
لکھتا ہے:۔

"اگر انہیں (بادشاہوں یا حکمرانوں کو) ہمارے خیال کے مطابق
پورا اترنا ہے تو دیکھیں ان کا طرزِ معاشرت کیا ہونا چاہئے۔ سب سے
پہلی بات تو یہ ہے کہ سوائے اشد مطلق ضروری اشیاء کے کسی کے
پاس اپنی کوئی ذاتی ملک نہ ہوگی۔ نہ اس کے پاس اپنا کوئی نجی کا مکان
ہوگا۔ نہ گودام جس میں کوئی دوسرا آنا چاہے اور نہ آ سکے۔ ان کی غذا

میں صرف ایسی چیزیں شامل ہونگی جن کی ضرورت تربیت یافتہ اور صاحب جرأت و عفت جنگ آزماؤں کو ہوتی ہے۔ انہیں شہریوں سے ایک مقررہ شرح تنخواہ کے وصول کرنے کا معاہدہ کرانا چاہیئے تاکہ ان کے سالانہ اخراجات کی کفالت ہوسکے، بس اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ یہ سب کے سب ایک جگہ رہیں اور ایک جگہ کھانا کھائیں۔ جس طرح لشکر میں سپاہی کرتے ہیں۔ ہم انہیں بتلائیں گے کہ سیم وزر تو تمہیں خدا کی طرف سے عطا ہو چکا ہے۔ جب وہ اعلیٰ دھات تمہارے اندر موجود ہے تو پھر اس میل کی تمہیں کیا ضرورت جو انسانوں میں رائج ہے تم ہرگز اس عطیہ سماوی کو اس آمیزش ارضی سے آلودہ اور ناپاک نہ کرو کہ یہ رائج اور عام دھات بہت سے ناپاک اعمال کی وجہ ثابت ہوئی ہے اور خاص اور اعلیٰ دھات تمہارے قبضے میں ہے وہ بالکل پاک ہے بس سارے شہر میں انہی لوگوں کو سونا چاندی چھونا چاہیئے۔ یہ لوگ نہ تو سونا چاندی پہنیں نہ ان کے برتنوں کچھ پئیں نہ اس چھت کے تلے رہیں جہاں سونا چاندی موجود ہے، ان کی نجات اسی میں ہے اور اسی طرح یہ ریاست کی نجات کرا سکتے ہیں اور اگر کہیں ان کے پاس اپنے ذاتی مکانات یا زمینیں یا اپنا ذاتی زر و مال ہوا تو یہ بیشک اچھے تاجر اور کسان تو بن جائیں گے لیکن محافظ نہ رہیں گے۔ بجائے معاون و مددگار ہونے کے یہ دشمن اور ظالم ہو جائیں گے یہ دوسروں سے نفرت کریں گے، دوسرے ان سے، یہ اوروں کے خلاف

سازش کریں گے اور دوسرے ان کے خلاف، خارجی دشمنوں سے
زیاں اندرونی مخالفت کے خوف ہیں ان کی زندگی گزریگی"
پھر دوسری جگہ بادشاہ کی صفات وہ اس طرح بیان کرتا ہے:۔

"شہروں کو بلکہ نوع انسانی کو اپنے مصائب سے اسوقت
تک نجات نصیب نہ ہوگی جب تک دنیا میں فلسفی بادشاہ نہ ہوں یا
بادشاہوں اور شہزادوں میں فلسفہ کی روح اور فلسفہ کی قوت نہ
آجائے یعنی جب تک سیاسی عظمت اور عرفان حقیقت دونوں
یکجا نہ ہوجائیں اور وہ عامیانہ طبائع جو ان میں سے صرف ایک
کی اتباع کرتے ہیں اور دوسرے کو چھوڑ دیتے ہیں، علیحدہ ہونے
پہ مجبور نہ ہوجائیں ایسا ہوجائے تو ہماری ریاست عالم وجود میں
آسکتی ہے اور اسی وقت اس کے لئے امکان حیات بھی ہے"

افلاطون کے الفاظ میں "جرأت، فراخدلی، ذکاوت اور حافظہ اس فلسفی
کے فطری صفات ہوں گے۔

"پالیٹکس" میں وہ اس عاقل کامل حکمراں کو تمام قانونی بندشوں سے آزاد
قرار دیتا ہے۔

افلاطون کے حکمران کا یہ تخیل محض خیالی ہے اس کو خود اس کا اعتراف
ہے کہ اس قسم کے بادشاہوں کا دنیا میں کبھی وجود نہیں ہے بلکہ وہ صرف عالم مثال
میں ہے۔ چنانچہ جس شہر میں ایسا حاکم حکمران ہو اس کے متعلق وہ کہتا ہے:۔

"میں سمجھتا ہوں کہ آسمان پہ اس کا نمونہ مرتب ہوا ہے اُسے جو

چاہے دیکھ سکتا ہے اور دیکھ کر اپنا گھر ٹھیک کر سکتا ہے لیکن یہ بات کہ یہاں اس کا وجود ہے یا کبھی ہو بھی سکتا ہے یا نہیں اس سے کوئی اثر نہیں پڑتا کیونکہ یہ دیکھنے والا تو ہمیشہ اسی شہر کے نمونے کے مطابق اپنی زندگی بسر کرے گا اور دوسروں سے اُسے کچھ سروکار نہ ہو گا۔"

تاریخ کا ایک دیانتدار محقق جب افلاطون کے اس خیالی حکمران کا مقابلہ خلفاءِ راشدینؓ سے کرتا ہے تو اس کا یہ افلاطونی نظریہ بالکل ہیچ نظر آتا ہے۔

خلافت و جمہوریت

جدید اصطلاح میں جمہوریت یا ڈیموکریسی اس نظام حکومت کو کہتے ہیں جو جمہور ہی کا بنایا ہوا ہو جمہور ہی اس کو چلانے ہوں اور جمہور ہی کا مفاد اس کا مقصد ہو۔ اس نظام میں عوام کسی بادشاہ کے احکام کے تابع نہیں ہوتے نہ زمین و ملک بادشاہ کی ذاتی ملک تصور کی جاتی ہے بلکہ عوام حکومت کے دستور و آئین کو خود مرتب کرتے ہیں اور خود ہی چلاتے ہیں۔ ان کے منتخب کردہ نمایندے حکومت چلانے کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ اس میں زمین و جائداد قوم کی ملک سمجھی جاتی ہے۔

اسلام میں اس قسم کی جمہوریت جس میں عوام مطلق آزاد ہوں اور سوائے اپنے بنائے ہوئے قانون کے اور کسی کے پابند نہ ہوں جائز نہیں ہے۔ اسلام عوام کو عام قانون سازی کے حقوق نہیں دیتا۔ وہ تمام قوانین جن پر اسلام کی بنیاد ہے قرآن کریم میں موجود ہیں۔ جن کا نفاذ جمہور پر فرض ہے۔ پہلے ہم دیکھ چکے ہیں کہ قدیم مفکرین نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ انسان خود اپنی فلاح کی راہ سے

واقف نہیں۔ صرف حاکم مطلق اس کے مفاد کو سمجھ کر اس کے لئے قانون وضع کر سکتا ہے۔ اس لئے جہاں تک آئین سازی کا تعلق ہے اسلام افراد کو خدائی قانون کا پابند کرتا ہے۔ البتہ ان تمام قوانین کے بنانے کا حق افراد کو حاصل ہے جو قرآن کریم میں مذکور نہیں ہیں۔

حق قانون سازی کے علاوہ اسلام افراد کی آزادی کو پورے طور سے تسلیم کرتا ہے۔ اسلام میں "جمہوریت" سے مراد "حریت جمہور" ہے۔

جمہور کو پورا حق ہے کہ وہ حکومت کی خامیوں پر تنقید کریں وہ خلیفہ کو اس کی غلطیوں پر ٹوک سکتے ہیں وہ اپنے نمائندے منتخب کر کے ایک مجلس شوریٰ مرتب کر سکتے ہیں۔ اسی طرح خلیفہ کو منتخب کرنے کا پورا حق جمہور کو حاصل ہے۔ ہر وہ شخص جو بالغ ہو اور معاملہ فہمی کی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہو۔ امام کے انتخاب میں حصہ لے سکتا ہے۔ علامہ ابوالحسن علی الماوردی حق رائے دہندگی کے لئے تین شرائط ضروری سمجھتے ہیں۔ اول حق پژوہی مع اپنی پوری شرطوں کے، دوسرے علم جس سے انہیں معلوم ہو کہ کون امامت کا اپنی تمام شرطوں کے ساتھ مستحق ہے۔ تیسرے دانائی و فکر[1] ۔ امیر وقت اگر چاہے تو رائے دہندگی کا کوئی معیار مقرر کر سکتا ہے۔ لیکن وہ معیار ایسا ہو گا جو ہر انسان عام فطری حالات میں حاصل کر سکے۔ ایسا معیار جس کی رو سے ایک خاص طبقہ دوسرے افراد کو دبالے ناجائز ہے۔ اسی طرح ہر شخص خلیفہ منتخب ہونے کا مستحق ہے بشرطیکہ اسلام کے قوانین کو نافذ کرنے کی تمام صلاحیتیں اس کے اندر ہوں۔ یہ امر کہ خلیفہ میں یہ صلاحیتیں موجود ہیں یا نہیں انتخاب کنندگان کی آراء پر منحصر ہے۔ علامہ

[1] احکام السلطانیہ ص ۴

ماوردی کی رائے میں امام میں مندرجہ ذیل شرائط اس کی اہلیت امامت کے لئے ضروری ہیں:-

(۱) حق رشد ہی (۲) علم یعنی اہلیت اجتہاد (۳) صحت حواس و نطق (۴) صحت اعضاء (۵) عقل و فراست (۶) شجاعت و دلیری (۷) نسب یعنی قریشیت۔

فارابی کے نزدیک یہ شرائط بارہ ہیں جو درج ذیل ہیں:-

(۱) صحت اعضاء جسمانی (۲) سمجھ (۳) جو کچھ کیا جائے اس پر غور و فکر کی صلاحیت (۴) عمدہ یادداشت (۵) حقائق کی تہ تک جلد پہنچنے کی صلاحیت (۶) مافی الضمیر کی ادائیگی کی طاقت (۷) لہو و لعب سے پرہیز (۸) کھانے پینے اور عیاشی کی زیادہ خواہش کی غیر موجودگی (۹) سچائی سے محبت اور جھوٹ سے نفرت (۱۰) فراخی قلب، انصاف کی محبت، استبداد اور ظلم سے نفرت (۱۱) عدل گستری کی طاقت۔ ادائیگی فرض میں پختگی (۱۲) کافی دولت۔

مجلس شوریٰ

اسلامی حکومت کی بنیاد افراد کے باہمی مشورے اور مرضی عامہ پر قائم ہے۔ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ کا قرآنی حکم آئین اسلامی کی روح ہے۔ امیر کا فرض ہے کہ حکومت کے ہر معاملے میں وہ عوام، علماء، وزراء، عمالِ حکومت اور مدبرین سیاست کے مشورہ پر عمل کرے۔ ہر بالغ ذی ہوش فرد کو حکومت کے معاملات میں مشورہ دینے اور حکام پر نکتہ چینی کرنے کا حق ہے۔ اس لئے اسلامی حکومت میں مجالس شوریٰ کا باقاعدہ قیام بہت ضروری ہے۔ اسلام کی ابتدائی

عہد میں حکومت کا کوئی کام بغیر باہمی مشورے کے انجام نہیں پاتا تھا۔ آنحضرت صلعم کے زمانے میں مسجد نبوی ایوان شوریٰ کا کام دیتی تھی جہاں اصحابہ کرام کو مشورے کے لئے جمع کیا جاتا تھا۔ اور آنحضرتؐ باوجود ہدایت وحی کے افراد کے مشورے سے جنگ کی اسکیمیں بنانے اور دوسرے اہم معاملات میں مشورے کرتے تھے۔ آنحضرتؐ کی وفات کے بعد "سقیفہ بنی ساعدہ" میں سب سے پہلی مجلس شوریٰ کا اجلاس ہوا، جس میں صدیق اکبرؓ کا انتخاب بہ حیثیت خلیفہ عمل میں آیا۔

مرکزی مجلس شوریٰ کو جدید اصطلاح میں ہم پارلیمنٹ کہہ سکتے ہیں۔ مرکزی پارلیمنٹ کی طرح صوبائی اسمبلیوں اور مقامی ایوان ہائے شوریٰ کا قیام بھی ضروری ہے۔ مقامی مجالس ہر گاؤں، قصبے اور شہر میں قائم ہونگی اور تمام بالغ افراد مقامی مجالس کے ارکان ہوں گے۔ مساجد اسلامی مسلمانوں کے پنچایت گھر یا ایوان شوریٰ ہیں۔ یہ مقامی مجالس رائے عامہ کے معلوم کرنے کا بہترین ذریعہ ہونگی۔ حکومت کی پالیسی، اس کے نافذ کئے ہوئے قوانین اور حکام کے عام طرز عمل پر یہ مجالس باضابطہ طور سے اپنی رائے کا اظہار کرینگی۔ اور مقامی ضروریات کے لحاظ سے اپنے حلقوں کے لئے فروعی قوانین بھی بنائینگی۔ یہی مجالس خلیفہ اور مرکزی و صوبائی ارکان کا انتخاب بھی کرینگی اور انتخابات کے وقت یہی رائے شماری کے مراکز (پولنگ سٹیشن) ہوں گے۔ مرکزی اور صوبائی ایوانہائے شوریٰ میں ایسے افراد کو منتخب کرنا چاہیئے جو اقتصادیات و سیاسیات میں مہارت تامہ رکھتے ہوں۔ جو اپنے علم اور تجربے کی بنا پر حکومت کو صحیح مشورہ دے سکیں۔ حکومت اگر ضرورت سمجھے تو ان مجالس کی رکنیت کے لئے ایک تعلیمی معیار مقرر کر سکتی ہے۔ یہی مجالس شوریٰ حکومت کے

اعمال اور اس کی پالیسی پر پوری نکتہ چینی کر سکیں گی اور اسٹیٹ کی آمدنی و اخراجات (بجٹ) پر بھی بحث کر سکیں گی۔ قرآن کریم کے بنیادی احکام کے ماتحت اور سنّت رسول کی روشنی میں قوانین بنانے کا حق بھی ان مجالس کو حاصل ہوگا۔ لیکن یہ واضح رہے کہ ان صوبائی اور مرکزی مجالس شوریٰ کے اختیارات جمہوری پارلیمنٹوں کے مقابلے میں بہت محدود ہوں گے۔ ان مجالس کے بنائے ہوئے قوانین اگر کسی پہلو سے بھی قرآن و سنت کی کسی فرع کے خلاف ہوئے تو عدالت کو حق ہوگا کہ وہ اس قانون کو مسترد کر دے۔ اس کیلئے ایک عدالت عالیہ SUPREME COURT کا قیام لازمی ہے جو نہ صرف ماتحت عدالتوں کی عدالت اپیل ہوگی بلکہ پارلیمنٹ کی قوانین کے جواز یا عدم جواز کا فیصلہ بھی اسی عدالت کے ہاتھ میں ہوگا۔ اسلامی حکومت کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اسلامی عدالت کسی مجلس قانون ساز یا کیبنٹ کے ماتحت نہیں ہے حتیٰ کہ خلیفہ کا حکم بھی کسی قانون کی ترجمانی میں محکمۂ عدل کو پابند نہیں کر سکتا۔

طریقۂ انتخاب خلیفہ کے انتخاب کا اسلام نے کونسا طریقہ مقرر کیا ہے؟ آیا حدودِ مملکت میں رہنے والے تمام مسلمانوں کی رائے کا فیصلہ انتخاب خلیفہ کی تکمیل کے لئے ضروری ہے یا صرف دارالخلافہ کے مسلمانوں کی رائے کافی ہے یا علماء و فقہا اور سرداران لشکر مل کر اس کو منتخب کر سکتے ہیں یا خلیفہ خود اپنا جانشین مقرر کر سکتا ہے؟ اسلام میں تمام فروعی مسائل کی صرف ایک بنیاد ہے وہ یہ کہ خلیفہ کو مسلمانوں کا اعتماد حاصل ہونا چاہئے۔ وہ اسی وقت خلیفہ سمجھا جا سکتا ہے جب یہ معلوم ہو جائے کہ تمام مسلمان اس کے انتخاب سے خوش ہیں

اس وقت تک وہ اس عہدہ پر فائز رہ سکتا ہے جب تک عوام کا اعتماد اس کو حاصل ہے۔ بہترین طریق کار یہی ہے کہ عام افراد جن میں رائے دینے کی اہلیت ہے ایک منظم طریقہ سے انتخاب خلیفہ کی کاروائی میں حصہ لیں۔ موجودہ زمانے میں یہ بالکل آسان ہے کہ تمام ممالک اسلامی کے رائے دہندگان اس انتخاب میں حصہ لے سکیں۔

لیکن اگر کسی وقت سلسلہ رسل و رسائل کی آسانی نہیں ہے اور انتخاب کا جلد ہو جانا رفع فساد کو روکنے کیلئے ضروری ہے تو ارباب حکومت یا سرداران عساکر کی ایک جماعت خلیفہ کو منتخب کر سکتی ہے لیکن یہ انتخاب اس وقت تک عارضی ہوگا جب تک تمام افراد جماعت کی رائے اس فیصلے کو تسلیم نہ کرلے۔ اسی طرح ایک خلیفہ اپنے بعد کسی لائق فرد کو اپنا جانشین مقرر کر سکتا ہے یا انتخاب کرنے کے لئے چند افراد کی ایک جماعت بنا سکتا ہے۔ لیکن خلیفہ کے اس فعل کی اطاعت اس کی زندگی کے بعد امت پر واجب نہیں ہے کیونکہ یہ اس کی ایک انفرادی رائے ہے اور امت کو بروقت انتخاب اس پر غور کرنا ہے اگر قوم اسی نامزدگی پر خاموشی کے ساتھ اعتماد کا اظہار کرتی ہے تو یہی انتخاب جائز سمجھا جائے گا۔ اگر کہیں رائے عامہ تربیت یافتہ نہیں ہے تو یہ انتخاب ان کے سرداروں اور امیروں کے ذریعہ عمل میں آسکتا ہے۔ لیکن اسلام ہر بالغ مسلمان سے اس کی توقع رکھتا ہے بلکہ اس پر واجب قرار دیتا ہے کہ وہ اپنے اندر وہ صلاحیتیں پیدا کرے کہ اپنا امام منتخب کر سکے۔

اسلام نے طریقہ انتخاب کے مختلف جزئیات کو حالات وقت اور افراد کی صلاحیت پر چھوڑ دیا ہے۔ اگر قوم زندہ ہے اور اس کے افراد میں احساس فرض

باقی ہے تو ہر طریقۂ انتخاب اور ہر طرز حکومت کامیاب ہو سکتا ہے جیسا کہ ابتدائی زمانۂ اسلام میں ہوا۔ لیکن جب قوم میں انحطاط رونما ہو جاتا ہے یا حسد و نزاع باہمی قوم میں راہ پا لیتے ہیں تو کوئی طریق کام نہیں دیتا۔

اسلامی آئین کی رُو سے انتخاب امیر کی تکمیل ایک بیعت اطاعت کے ذریعے ہوگی۔ جو منتخب شدہ خلیفہ کے ہاتھوں پر عوام براہ راست یا کسی خاص جماعت کے ذریعے لیں گے۔ اور خلیفہ بھی اسی طرح احکام آلٰہیہ کے مطابق حکومت کرنیکا اقرار کریگا۔ باہمی بیعت اور اقرار کی یہ رسم خلیفہ اور عوام کے درمیان ہوگی لیکن امیر کی ذاتی یا اسی کی اولاد کی اطاعت کا کوئی حلف وفاداری OATH OF ALLEGIANCE مسلم عوام نہیں اٹھا سکتے جیسا کہ جدید سیاسی آئین بالخصوص شہنشاہی آئین میں دستور ہے۔ عوام صرف احکام الٰہی اور سنت رسول پر بیعت اطاعت کریں گے۔ دوسری طرف امیر اس کا اقرار کریگا کہ وہ خدا کے احکام و اوامر کو سنت رسول کی روشنی میں نافذ کریگا اس طرح یہ بیعت کی رسم یک طرفہ اقرار اطاعت نہیں بلکہ عوام اور امیر میں ایک معاہدہ ہے جس میں انسان کی حکمرانی اور حاکمیت کا کہیں ذکر نہیں۔ دونوں طرف سے صرف خدا کی حکومت اور مطلق العنانی کا اقرار ہے۔ اس معاہدے کی رُو سے امیر کی اطاعت صرف اس وقت تک فرض ہے جب تک وہ احکام الٰہی کا خود پابند اور اوامر و نواہی کے قیام میں ممد و معاون ہے۔ ورنہ دوسری صورت میں بھی اطاعت سب سے بڑا جرم ہے۔

طرزِ حکومت | اسلامی طریقۂ حکومت نہ شخصی ہے نہ جدید مفہوم میں جمہوری نہ اشیائی۔ اسلامی دستوران تمام مختلف طریقہائے حکومت

کے صحیح امتزاج پر مؤسس ہے۔ افراد کو اسلام میں یہ حق حاصل ہے کہ وہ خلیفہ کے افعال پر تنقید کر سکتے ہیں لیکن ایک ضبط نظام کے تحت ہیں کیونکہ کوئی منظم حکومت بے بنیاد پروپیگنڈوں کی اجازت نہیں دے سکتی جس کا لازمی نتیجہ فساد اور بدامنی (انارکی) ہیں رونما ہوتا ہے۔ اسلام افراد کی آزادی اس حد تک تسلیم کرتا ہے کہ وہ اسٹیٹ کی خامیوں کی طرف توجہ دلا سکیں۔ احکام الہٰی کے نفاذ میں جو کوتاہی ہو اسکے خلاف آواز بلند کر سکیں۔ اسلامی اسٹیٹ میں افراد خود حکومت کو چلانے کے ذمہ دار ہیں۔ اسلئے خلیفہ کو آنحضرت ﷺ بالواسطہ یا بلاواسطہ ہر اہم کام میں مشورہ کرنا ضروری ہے تاکہ ہر امر میں ملت کا ضمیر اجتماعی نمودار رہے۔ عام حالات میں اہل مشورہ کی اکثریت کی رائے پر عمل پیرا ہونا امیر کیلئے لازمی ہے خود آنحضرت ﷺ نے جنگ احد کے موقعہ پر صرف اسلئے اپنی رائے کے خلاف باہر نکل کر جنگ کرنا منظور کیا کہ حضرت حمزہ اور انکے ساتھیوں کی جو اکثریت میں تھے یہ رائے تھی۔ خلافت راشدہ بالخصوص حضرت عمرؓ کے عہد میں اس قسم کی مثالیں اکثر ملتی ہیں۔ لیکن جب خلیفہ پر ہر طرح سے عوام کا اعتماد ہو اسکو اسلام غیر معمولی حالات میں ضرور یہ حق دیتا ہے کہ وہ مشورے کو نظر انداز (OVER RULE) کر دے جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ نے عدم ادائیگی زکوٰۃ کے سلسلہ میں کیا۔ لیکن اسپر بھی حکومت وقت کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اگر وہ چاہے تو آئین میں واضح کر دے کہ امیر ہر وقت مجلس شوریٰ کے فیصلوں کا پابند ہوگا۔

اکثریت کا کوئی فیصلہ اسلام کے نزدیک خلیفہ کو پابند نہیں کر سکتا۔ خلیفہ خود اگر چاہے تو مجلس شوریٰ کی اکثریت یا اتفاق رائے سے فیصلے کو تسلیم کرلے لیکن خلیفہ کا حکم آخری ہے اور اسکی اطاعت ہر فرد پر لازم ہے اکثر حالات میں اس سے روگردانی کفر کے مترادف ہے۔ بشرطیکہ اس کا کوئی حکم صریحاً ارتکاب گناہ پر مائل نہ کرے۔

پس اسلام میں جمہوریت اور آمریت دونوں شامل ہیں۔ اس حکومت کی بنیاد انفرادی آزادی اور شوریٰ بینہم پر ہے۔ جہاں تک جزئیات کا تعلق ہے وہ طریقہ انتخاب کی طرح حالات کے ساتھ بدل سکتے ہیں۔ حکومت کی ظاہری شکل

کچھ بھی ہو۔ خواہ امیر ایک ہو یا چند امراء کی ایک کونسل، مجلس شوریٰ کے اختیارات محدود ہوں یا امیر کی رضامندی سے غیر محدود، عمال کا تقرر انتخاب سے ہو یا امیر کی نامزدگی سے دستور کی بنیاد اس پر ہوگی کہ ملک و زمین حکم وآئین میں امیر کی ذات صرف ایک متولی کی ہوگی۔ حکومت افراد کے مشورے سے ہوگی اور افراد ہر معاملہ میں صرف قانون الٰہی کے پابند ہوں گے۔ ورنہ ہر طرح آزاد ہوں گے۔ اور حکومت کا مقصد دنیا میں قیام امن اور رفع فساد ہوگا۔ بہترین حکومت اسلام کے نزدیک وہ نہیں جس کی بنیاد کسی خاص اصطلاحی اصول پر ہو (اسی لئے اس کو ہم نہ جمہوری کہہ سکتے ہیں نہ شاہی اگر کوئی اصطلاح اس کے لئے ہو سکتی ہے تو وہ "دینی حکومت" ہے) بلکہ بہترین حکومت وہ ہے جس میں اسلامی اصولوں کا نفاذ سب سے بہتر ہو، جس میں افراد کا فطری حق حریت ان کے پاس ہو اور اسٹیٹ کسی خاص فرد یا طبقے کی ملک نہ ہو۔ ایک جدید مفکر سر فریڈرک پالک اپنی تصنیف "تاریخ سیاسیات" میں نظام سلطنت پر بحث کرتے ہوئے جن خیالات کا اظہار کرتا ہے وہ قابل ستائش ہے وہ لکھتا ہے:۔

"سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کسی مخصوص نظام سلطنت کی اچھائی اور برائی دریافت کرنے کے لئے کیا معیار ہونا چاہیئے؟ اس کا جواب بہت صاف اور سہل ہے مناسب اور درست آئین وہ ہے جو عام اور مشترک فلاح کیلئے بنایا اور برتا جائے۔ اب اس میں شاہی اختیارات خواہ ایک شخص کو حاصل ہوں یا چند افراد کو یا بہت سے آدمیوں کو۔ جو آئین محض کسی خاص طبقے کی اغراض

پر مبنی ہو گا وہ ناقص ہو گا چاہے تمام قوم میں اس خاص طبقے کے افراد سب سے زیادہ ہوں۔ معمولی طرز حکومت ملوکیت، اعیانیت اور دولت ہیں لیکن بگڑ کر یہی صورتیں خود سری، عدیدیت اور عومیت ہو جاتی ہیں۔"

اسی طرح ارسطو کے نزدیک "کسی حکومت کے حسن و قبح کے جانچنے کا معیار یہ ہے کہ وہ حکومت رعایا کی فلاح و بہبود کی ترقی کے لئے کس قدر کوشش کرتی ہو" وہ اپنی کتاب "سیاسیات" میں لکھتا ہے:۔

"ایک بگڑی ہوئی حکومت میں اچھا آدمی بڑا متمدن خیال کیا جاتا ہے لیکن معقول اور بہتر حکومت میں اچھا آدمی اور اچھا متمدن مترادف الفاظ ہیں اور اس معقول حکومت کا مقصد حریت ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ انسان اپنی زندگی کسی دوسرے کی خدمت میں صرف نہ کرے کیونکہ رعایا مشیران سلطنت کیلئے یا قوم بادشاہوں کے لئے نہیں مخلوق ہوتی ہے بلکہ برعکس اس کے مشیران سلطنت کا وجود رعایا کیلئے ہے اور بادشاہوں کا قوموں کے لئے۔"

حیرت یہ ہے کہ اس نظریئے کے باوجود ارسطو "غلامی" کا سبق دیتا ہے اور ان کو جاندار اوزاروں سے تشبیہ دیتا ہے وہ شہنشاہیت کا قائل ہے مگر ایسی شہنشاہیت کا جس میں افراد خوش ہوں اور آزاد ہوں (سوائے اس طبقے کے جو غلام ہے) ارسطو کا یہ نظریہ اسلام سے صرف اس حد تک قریب ہے جہاں انسانوں کی فلاح و بہبود اور حریت کا ذکر ہے۔ لیکن اس فلاح کیلئے وہ شہنشاہیت کے جس نظریئے کا حامی ہے وہ بذاتِ خود مجموعی طور سے انسانی حریت سے متصادم ہے

اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ اس کے نزدیک حکومت قانون کی تابع نہیں بلکہ قانون حکومت کا تابع ہے۔ برخلاف اس کے اسلام میں حکومت قانون کے تابع ہے اور اس کا نفاذ ہی اس کا مقصد ہے۔

جس طرح ملوکیت اور اعیانیت بہت سی خرابیوں کا سرچشمہ ہے اسی طرح خالص "جمہوریت" میں بھی بہت سے نقائص ہیں۔ اس نظام میں چونکہ قانون سازی کا حق عوام کو ہوتا ہے اور حکومت کے فیصلے اکثر لچر ہوتے ہیں۔ عوام کے منتخب شدہ نمائندے جو یہ قانون بنانے اور فیصلوں میں رائے دیتے ہیں بالعموم وہ لوگ ہوتے ہیں جو دجل و فریب میں ماہر اور خود نمائی میں یکتا ہوتے ہیں۔ قابل افراد انتخابی مہم میں خود کو آلودہ نہیں کرتے اس لئے اسٹیٹ ان کی اہلیت سے فائدہ نہیں اٹھا سکتی۔ علامہ اقبال رح نے بالکل صحیح فرمایا ہے:۔

گریز از طرز جمہوری غلام پختہ کارے شو   کہ از مغز دو صد خر فکر انسانے نمی آید

عوام کے بنائے ہوئے قوانین بالعموم ان کے خیالات کا آئینہ ہوتے ہیں جن کا مقصد تبلیغ حق نہیں۔ بلکہ عوام کے جذبات کی نمایندگی ہوتا ہے۔ اسی قسم کے قوانین کا نتیجہ تھا کہ سقراط کو تعلیم حق پیش کرنے کی سزا میں زہر کا پیالہ پینا پڑا۔

پروفیسر ایڈورڈ جنکس "تاریخ سیاسیات" میں بالکل صحیح لکھتا ہے:۔

"اگر فی الحقیقت سچ پوچھا جائے، جیسا کہ واقعات تاریخ سے ظاہر ہو چکا ہے اس (جمہوریت) کا نتیجہ سہ گانہ نتائج میں سے ایک ضرور ہوتا ہے یا تو ملک متخاصم جماعتوں میں تقسیم ہو کر پارہ پارہ ہو جاتا ہے (جیسا کہ پولستان کا حشر ہوا) یا انتخاب کرنے والے عمداً

کسی ایسے شخص کو منتخب کر لیتے ہیں جس کا کوئی دشمن ہی نہیں ہوتا اور جو دوسروں کے تار پر کٹھ پتلی کی طرح ناچتا ہے۔ یہ ہے حالت آج کل کے جمہوری انتخاب صدارت کی جو در اصل بادشاہ ہی ہے گو نام مختلف ہے۔ صرف اس وقت جبکہ سخت خطرات رونما ہوتی ہیں اور اس وقت بھی جبکہ انتخاب کرنے والے قطعی ایماندار ہوتے ہیں یہ ممکن ہوتا ہے کہ انتخاب کے ذریعہ سے فی الحقیقت کوئی عمدہ آدمی منتخب ہو سکے۔"

افلاطون جس کے زمانے میں یونان میں بلا واسطہ عمومیت یا جمہوریت جاری تھی اس نظام کا سخت دشمن ہے اس کے خیال میں اس سے باپ بیٹوں، جوان بڈھوں اور استاد شاگردوں کا امتیاز بالکل ختم ہو جاتا ہے۔ مرد و عورت بالکل آزاد ہو جاتے ہیں وہ "ریاست" میں لکھتا ہے:۔

"جمہوریت میں حکومت کی تقریباً ساری قوت انہیں (نااہلوں) کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ ان میں جو ذرا تیز اور ذہین ہوتے ہیں وہ تقریریں اور کام کرتے ہیں اور باقی دوسرے منبر کے ارد گرد بھنبھناتے پھرتے ہیں اور کسی کو مخالفت میں ایک لفظ نہیں کہنے دیتے چنانچہ جمہوریت میں کم و بیش ہر چیز کا انتظام و انصرام نکھٹوؤں کے ہاتھ ہی میں ہوتا ہے۔"

"جمہوریت" میں وہ ثابت کرتا ہے کہ "آزادی" کی افراط غالباً افراط غلامی کا باعث ہوتی ہے۔ لہٰذا جمہوریت اور صرف جمہوریت شخصی حکومت کی

بنیاد رکھتی ہے یعنی نہایت شدید آزادی، نہایت سنگین اور خونخوار غلامی کی بنیاد رکھتی ہے۔"

اس مختصر بحث سے اس حقیقت کا اظہار ہے کہ وہ تمام دستورہائے حکومت لاحاصل اور قطعی ناپائدار ہیں جن میں قانون سازی کے عام حقوق انسانوں کو حاصل ہوں خواہ وطرز حکومت شاہی ہو یا اعیانی ہو یا جمہوری۔ اسلام جمہور کی حریت کا حامی ہے اور اس معنی میں "جمہوریت"، کا طرفدار کہ حکومت کو قوانین اسلام کے مطابق چلانے میں جمہور برابر کے شریک ہوں، اپنے حاکموں پر تنقید کر سکیں اور ہر حیثیت میں ان کے مساوی حقوق سیاسی کے مالک ہوں۔

روسو "جمہوریت" کی یہ تعریف کرتا ہے:۔

"اسی وجہ سے میں ہر اُس ریاست کو جمہوریہ کہتا ہوں جس پر قوانین کے ذریعہ حکومت ہوتی ہو۔ چاہے ریاست کا طرز حکومت کچھ بھی ہو۔ اس لئے کہ صرف اسی صورت میں مفاد اجتماعی مقصود ہوتا ہے اور جمہوریہ واقعی ایک حقیقت ہوتی ہے۔ ہر وہ حکومت جو قانوناً جائز ہو جمہوری حکومت ہے۔"

لیکن "جمہوریت"، کا لفظ اسلامی حکومت کے ساتھ جب استعمال کیا جائے گا اس کا مفہوم جدید جمہوریت سے بڑی حد تک مختلف ہوگا۔

خلافت اور قریشیت

اسلام کی بنیاد ایک مطلق اور آزاد مساوات انسانی پر قائم ہے۔ اسلام میں کوئی گروہ، جماعت یا قبیلہ، نسل یا خاندان یا ملک وزمانہ ایک دوسرے پر فوقیت وترجیح نہیں رکھتے،

ترجیح کا سبب صرف تقویٰ ہے۔

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ۔

پچھلی اُمتوں کی گمراہیوں کو دیکھتے ہوئے جو عدم مساوات انسانی اور شرف نسل و قبیلہ کا نتیجہ تھیں۔ رسول کریم نے یہاں تک فرمایا تھا:۔

"میں بھی ایسا ہی بشر ہوں جیسے تم سب ہو۔ تمہاری طرح میری مغفرت بھی خدا کے رحم و کرم پر ہی موقوف ہے"

شریعت اسلامی کے نزدیک جس کی بنیاد ہی جمہوریت و حریت انسانی پر ہے اور جس کا واحد مقصد انسان کو ذلت و پستی سے نکال کر علو و ارتفاع کی آخری حد تک پہنچانا ہے۔ یہ بالکل ناممکن تھا کہ ایک انسان ایک جماعت قوم یا قبیلے کو اسی جیسے دوسرے پر صرف اس لئے ترجیح دیجاتی کہ اس کی گذشتہ نسلیں اپنے اعمال و کردار کی رُو سے فائق و مرجح رہ چکی ہوں۔ اسلام میں اسی لئے کسی ایسے نظام کی گنجائش نہیں جس میں مذہبی پیشواؤں کی مشیخت یا پاپائیت یا نسل و وطن کا کوئی امتیاز ہو۔ اسلام تمام نسلوں اور قوموں کے باہمی ارتباط و اتحاد سے ایک نئی ملت "امۃً مسلمۃ لک" پیدا کرنا چاہتا ہے جس کی بنیاد اسلاف کی روایات پارینہ اور نسب فروشی کے غرور باطل کے بجائے افراد کی ذاتی اصلاح و احتساب نفس اور اتقاء خدا پر ہو۔ جس مذہب کے بنیادی اصول و آئین فطرت انسانی پر مبنی ہوں نہ کہ کسی خاص قوم کی خصوصیات نسلی پر اس کا داخلی نظام صرف اس کے افراد کی یک جہتی و ہم خیالی اور باہمی ارتباط پر قائم ہو سکتا ہے جس کا مقصد اس مذہب کے عالمگیر اصولوں کی شدت کے ساتھ پابندی ہو، نہ کہ کسی نسلی یا جغرافی اتحاد پر،

یہی وجہ ہے کہ گھر کے بوجہل اور بولہب رسولؐ کے دشمن اور باہر کے بلالؓ حبشی وصہیب رُومی ان کے دوست ہیں، جن کے متعلق ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتے کہ وہ مسلمان تھے، حضرت سلمان فارسی سے جب ان کے خاندان کا حال پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ " سلمان ابن اسلام "

علامہ اقبالؔ فرماتے ہیں:۔

مذہب او قاطع ملک و نسب　　از قریش و منکر از فضل عرب

در نگاہِ او یکے بالا و پست　　با غلام خویش بر یک خواں نشست

چونکہ قبل از اسلام نسل و قبیلہ کا بت، تمام عرب پر حاوی تھا اس لئے رسول کریمؐ نے اس خطرے کو محسوس کرتے ہوئے کہ مبادا میرے بعد ٹوٹا ہوا بُت پھر جڑ جائے متعدد مواقع پر ملّتِ اسلامیہ کو مساوات انسانی کے قائم کرنے اور بتانِ رنگ و بو کو توڑنے پر زور دیا۔

حجۃ الوداع میں ایام تشریق کے درمیان آپ نے فرمایا:۔

" اے لوگو! تمہارا پروردگار ایک ہے، کسی عربی کو عجمی پر یا عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت نہیں اور نہ کسی کالے کو گورے پر نہ گورے کو کالے پر مگر تقوے کے ساتھ۔ روایت حضرت جابر بن عبداللہؓ

دوسری ایک روایت حضرت حذیفہ رضؓ نے اس طرح بیان کی ہے:۔

" تم سب آدم علیہ السلام کی اولاد ہو اور آدم علیہ السلام مٹی سے پیدا کئے گئے۔ ہر قوم کو چاہیئے کہ اپنے آباؤ اجداد پر فخر کرنے سے باز آجائے۔ ورنہ اللہ کے نزدیک وہ نجاست کے کیڑوں سے بھی زیادہ

ذلیل ہوں گے"   (رواہ البزار فی مسندہ ص۱۴۹)

قرآن کریم میں کمال تعمیم کے ساتھ اطاعت "امیر" کا حکم دیا گیا ہے جس کو خود مسلمانوں نے منتخب کیا ہو (لفظ منکم کا یہی مفہوم ہے) نہ کہ وہ کسی خاص خاندان سے تعلق رکھتا ہو۔ مزید برآں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے ان الفاظ نے اس مسئلہ کو بالکل صاف کر دیا جو حقیقت میں مسئلہ خلافت وامارت کا بنیادی اعلان ہے۔ آپؐ نے فرمایا:۔

اسمعوا واطیعوا وان ولی علیکم عبد حبشی ذو زبیبۃ

سنو اور حکم بجا لاؤ اگرچہ تمہارے اوپر کوئی غلام حبشی مقرر کیا جائے جس کے منہ سے جھاگ نکلتی ہو۔

لیکن ان واضح اور صریح احکامات کے باوجود بعض احادیث کے غلط مطالب کی بنا پر خلافت کو تقریباً نو صدیوں تک قریش میں محدود رکھنے کا عقیدہ کارفرما رہا۔

دراصل واقع یہ تھا کہ افراد قریش چونکہ اسلام کے پہلے علمبردار تھے۔ ان کے چند برگزیدہ اصحاب نے "دین" کے قیام کے لئے اپنے گھر بار چھوڑے تھے انہی کو جناب رسالت مآبؐ کے حضور میں رہنے کا زیادہ موقعہ ملا تھا اس لئے فطری طور سے ان میں وہ صلاحیتیں موجود تھیں جو حکومت کی ذمہ داریوں کے لئے ضروری ہیں اسلئے ان کی اس استعداد کی بنا پر رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا:۔

"امامت قریش کو سزاوار ہے۔ جب فیصلہ کرتے ہیں، عدل کرتے

ہیں۔ وعدہ کو پورا کرتے ہیں۔ رحم اگر چاہو تو مہربانی کرتے ہیں"
(مسند ابوداؤد طیالسی۔ روایت ابوہریرہ)

اس روایت سے بالکل ظاہر ہے کہ قریش کی صفات عدل، ایفاء عہد اور صلۂ رحم کی بنا پر ان کو حکومت کا اہل قرار دیا گیا ہے۔

ترمذیؒ نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ:-

"حکومت قریش میں، قضا انصار میں اور اذان حبشیوں میں رہنی چاہیئے"

ان دونوں احادیث میں کہیں خلافت کو قریش میں محدود کرنے کا کوئی حکم نہیں دیا گیا بلکہ صرف یہ بتلایا گیا ہے کہ چونکہ قریش میں فلاں فلاں خوبیاں ہیں اس لئے ان میں حکومت رہنی چاہیئے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جس قوم میں وہ صلاحیتیں پیدا ہونگی وہی حکومت کی سزاوار ہوگی۔

اس لئے یہ عقیدہ کہ قریشیت خلافت کی ایک لازمی شرط ہے جیسا کہ علامہ ماوردی نے لکھا ہے صرف غلط فہمی پر مبنی ہے۔

خلافت و سلطنت کا متوازی نظام

مذہب و سیاست کے باہمی تعلق کی تاریخ تقریباً ہر قوم میں یکساں رہی ہے۔ ابتداً ہر جگہ سیاست مذہب کا جزو اور اس کے ماتحت رہی لیکن جتنا زمانہ گزرتا گیا سیاست و مذہب میں جدائی ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ سیاست بالکل آزاد بلکہ مذہب پر حاوی ہوگئی اور بادشاہ جو سیاست کا نمائندہ ہے مذہبی جماعتوں پر حاوی ہوتا گیا۔

مصر کی تاریخ قدیم سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں وہاں فیسوں کے اعلیٰ فرقے کا بادشاہ پر اتنا اثر تھا کہ بادشاہ اپنا کھانا تک خود پسند نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے مرنے کے بعد یہ مذہبی رہنما عدالت عام میں اس کی روح کیلئے جزا و سزا کا فیصلہ کرتے تھے اور اسی کے موافق اس کے ورثا اس کی عزت کرتے تھے۔ وہ سلطنت کی ایک تہائی زمین کے مالک سمجھے جاتے تھے۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد فراعنہ مصر نہ صرف مذہب سے آزاد ہوئے بلکہ خود قوانین کا سرچشمہ بن گئے اور ربوبیت کے مدعی بن بیٹھے۔ قدیم ہندوستان میں برہمن کی حیثیت بادشاہ سے کہیں زیادہ تھی۔ بادشاہ کی آتما کی مکتی برہمن کی دعاؤں پر منحصر سمجھی جاتی تھی۔ اس کے گرد پروہتوں کا مجمع رہتا تھا۔ تخت نشینی کی رسم میں اس کی برکت حاصل کرنی ضروری تھی۔ لیکن چندر گپت کے زمانے میں بادشاہ کی ذات دنیا میں سب سے اعلیٰ شمار کی جانے لگی۔ منو کے قانون کے مطابق بادشاہ کی ذات سب سے زیادہ مقدس اور پاک ہے۔ بادشاہ کو زمین پر پرماتما کا اوتار سمجھا جانے لگا تھا اور برہمن کی پوزیشن ایک معمولی شاہی ملازم سے زیادہ نہ تھی جس کا کام صرف عبادت (آرتی) وغیرہ کا انتظام کرنا تھا۔

ایران میں بادشاہ ابتداءً مذہبی گروہ کا غلام تھا گشتاسپ جیسا زبردست بادشاہ "زردشت"، کی تعلیمات پر عمل پیرا اور اس کا تمام سیاسی نظم و نسق زردشت کی احکامات کے موافق چلتا تھا۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد خود بادشاہ کی عظمت اسقدر بڑھ گئی کہ اس کی کہیں مثال نہیں۔ اس کا دربار دنیا میں "یزدان"، کے آسمانی دربار کی نقل سمجھا جانے لگا۔ اس کی تکریم و تعظیم اس طرح کی جانے لگی جس طرح خدا کی جب وہ

سُرخ لباس زیب تن کر کے سر پہ طرہ لگا کر اپنے سونے کے تخت پر بیٹھ کر ہاتھ میں سونے کا عصا لے کر اور بغل میں چمکدار تلوار لٹکا کر دربار کرتا تو اس کی رعایا وزراء اور سفرا اس کے سامنے اسی طرح زمین بوس ہوتے تھے جس طرح خدا کے سامنے۔ اس کے سامنے نذریں اسی طرح پیش کی جاتی تھیں جس طرح خدا کے سامنے قربانی۔

بنی اسرائیل میں ابتداءً خود خدا یا آدے یا یہودا کے نام سے بادشاہ ہوتا تھا اور اسی کا قانون حکومت میں نافذ تھا۔ یہ قانون موسوی وہی قانون ہے جو حضرت موسیٰؑ پر کوہ سینا کی تنہائیوں میں نازل کیا گیا تھا۔ یہ قانون ایک زریں تابوت میں ایک پردے کے پیچھے قبۃ العہد میں رکھا رہتا تھا جس کے اوپر ایک زریں "عرش رحمت" ہوتا تھا۔ یہ قبہ خدا کا مسکن سمجھا جاتا تھا۔ اور یہیں سے احکام حاصل کئے جاتے تھے۔ بڑے بڑے مقدمات کا فیصلہ اسی قبے کی طرف رجوع کر کے کیا جاتا تھا۔ تمام زمین خدا کی ملک سمجھی جاتی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ ان میں اپنے اندر ایک بادشاہ ہونے کی خواہش پیدا ہوئی۔ تاکہ وہ بھی دوسری قوموں کی ہمسری کر سکیں۔ آخر کار سموئیل نبی کی زبانی ان کی اس خواہش کے پورا ہونے کی اطلاع دی گئی۔ لیکن ایک عرصۂ دراز تک بنی اسرائیل کی یہ شاہی مذہبی اثر کے ماتحت رہی۔ بادشاہ دیندار اور مذہبی ہوتے تھے اور صرف قانون موسوی کی اتباع و تقلید ان کا نصب العین ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ دین و سیاست میں تفریق شروع ہوئی۔ مذہبی امور جس شخص کی ذات سے وابستہ ہوئے وہ کاہن کہلایا۔ وہی حضرت موسیٰ کا خلیفہ سمجھا جاتا تھا۔ قربانی اور نماز کے تمام کام اس کی رائے سے ہوتے تھے جس طرح مسلمانوں میں خلیفہ کے لئے قریش ہونا ضروری ہو گیا تھا اسی طرح اس کاہن کے لئے بھی یہ شرط

تھی کہ وہ حضرت ہارون علیہ السلام کی اولاد سے ہو۔ کیونکہ (بقول علامہ ابن خلدون) حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کوئی اولاد نہ تھی۔ دنیوی نظام کو چلانے کے لئے ستر رئیسوں کو منتخب کر لیا جاتا تھا جو ان میں احکام عامہ جاری کرتے تھے۔ کاہن دنیوی نظام سے بالکل علیحدہ رہتا تھا۔

تاریخ یونان اور روم میں بھی پہلے بادشاہ دیوتاؤں کے مطیع و فرمانبردار نظر آتے ہیں۔ قوانین بنانے اور ان کو نافذ کرنے میں دیوتاؤں کی رہنمائی ہر جگہ نظر آتی ہے۔ لیکن یوماً فیوماً ہر دو ممالک میں بادشاہ نے خود کو ان دیوتاؤں کا جانشین بنانا شروع کیا اور تمام بزرگی اور تقدس جو دیوتاؤں کے لئے مخصوص تھا بادشاہوں کی ذات میں منتقل ہو گیا۔ یونانی بادشاہ کا سلسلۂ نسب دیوتاؤں بالخصوص "زیوس" اس سے ملایا جانے لگا۔ جتنی عظمت دیوتاؤں کی ہوتی تھی تقریباً وہی ان بادشاہوں کی ہونے لگی۔ چنانچہ قیصر روم سونے کی داڑھی لگا کر بجلی کی سی چمک کے ساتھ جیوپیٹر (مشتری) کی حیثیت سے عوام میں اپنا دیدار کراتا اور اس وقت اسکی ویسی ہی پرستش کی جاتی جیسی کہ دیوتاؤں کی۔

عیسائیت کے ظہور کے بعد صرف چرچ کو قوانین بنانے اور احکام نافذ کرنے کا اختیار تھا۔ بادشاہ ان ہی قوانین کو نافذ کر سکتا تھا جن پر چرچ کی مہر تصدیق و مقبولیت ثبت ہوتی تھی۔ جب تک پوپ بادشاہ کو تاج نہ پہناتا اور اپنی برکات سے سرفراز نہ کرتا بادشاہ تخت پر نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ لیکن چرچ اور اسٹیٹ کی باہمی رقابت بہت جلد شروع ہو گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیاست مذہب سے بالکل آزاد ہو گئی۔ پوپ کی سیاسی اہمیت بالکل ختم ہو گئی اور اسٹیٹ بالکل

دنیاوی SECULLAR بن گئی۔ آج بھی اسٹیٹ کی بعض رسومات میں بعض ممالک میں چرچ کو کچھ دخل ہے مگر وہ محض ایک پرانی رسم کی یادگار کے طور سے۔

مسلم تاریخ میں چار صدیوں تک دین و سیاست میں کوئی تقسیم پیدا نہیں ہوئی خلافت اگرچہ ملوکیت بن چکی تھی لیکن خلیفہ بہرحال دین و سیاست کا مرکز مانا جاتا تھا۔ اگرچہ اس کی طاقت بہت کمزور ہو چکی تھی لیکن پانچویں صدی میں خلافت کے اندر سلطنت وجود میں آگئی اور دین و سیاست کی باقاعدہ تقسیم شروع ہوگئی صرف مذہبی امور مثلاً اماموں اور قاضیوں کا تقرر وغیرہ خلیفہ کے حدود اختیارات میں آگئے اور تمام سیاسی حقوق سلطان کی طرف منتقل ہوگئے۔

ایک حکومت میں دوسری حکومت کس طرح وجود میں آئی اس کی تفصیلات اصل کتاب میں بیان کی گئی ہیں ۔ یہاں صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ اسلام میں اس کی ہرگز اجازت نہیں کہ مذہب سیاست کی تقسیم کر کے خلافت اور سلطنت یا خلافت اور امارت کے نام سے ایک ہی اسٹیٹ میں دو مختلف ادارے قائم کئے جا سکیں۔ اسلام کے مقرر کردہ نظام حکومت میں دو عملی سیاست کا کوئی تخیل موجود نہیں ہے۔ مسلمان کو صرف ایک امیر کی اطاعت کا حکم ہے۔ اسلام "دین و دولت" کی اس تقسیم سے بالکل بیزار ہے ؎

ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی ہوس کی امیری ہوس کی وزیری
دوئی ملک و دیں کے لئے نامرادی دوئی چشم تہذیب کی نابصیری
یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشین کا بشیری ہے آئینہ دار نذیری
اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی کہ ہوں ایک جنیدی و اردشیری

(اقبال)

علامہ ابوالحسن ماوردی غالباً پہلے مصنف ہیں جنھوں نے اسلامی سیاست پر نظری بحث کی ہے۔ ان کے نزدیک خلافت کے اندر نظام امارت اگر بزور و قوت وجود میں آجائے تو مجبوراً اس کی اطاعت مسلمانوں پر لازم ہوگی بشرطیکہ امیر خلیفہ سے بالکل آزاد نہ ہوجائے "احکام السلطانیہ"[1] میں وہ لکھتے ہیں:—

"امارت استیلاء جو بلا اختیار امام منعقد ہوتی ہے یہ ہے کہ امیر کو اپنی قوت سے کسی علاقہ پر غلبہ حاصل ہوجائے اور امام اس کو امیر تسلیم کرکے تمام انتظامی و سیاسی اختیارات تفویض کردے، اس صورت میں امیر مستقل حکمران ہوگا۔ لیکن اپنے اذن کی وجہ سے احکام دینیہ کا نافذ کرنے والا سمجھا جائے گا تاکہ ناجائز اور بے ضابطہ امارت جائز اور باضابطہ ہوجائے یہ امارت اگرچہ عرفی تقرر امارت کی شرائط و احکام سے خالی ہے، مگر شرعی قوانین کا تحفظ اور احکام دینیہ کی بقا ایسے امور نہیں ہیں جو کسی فاسد و مختل حالت میں چھوڑ دیئے جائیں۔ لہٰذا استیلاء و اضطرار کی وجہ سے اس میں وہ امور جائز کر دیئے گئے جو امارت استکفاء میں ناجائز تھے۔ اس لئے کہ اضطرار و اختیار کی شرائط ایک دوسرے سے جُدا ہیں۔

امیر بالاستیلاء پر سات امور لازم ہیں۔ اگرچہ امام بھی اس کا شریک ہے مگر امیر کی ذمہ داری بہت زیادہ ہے۔ (۱) منصب امامت خلافت نبوی اور تدبیر ملی کو باقی رکھے تاکہ موجبات شرعیہ اور جو احکام ان پر متفرع ہوتے ہیں محفوظ رہیں (۲) دینی اطاعت پر پختگی سے عامل

---

[1] ترجمہ اردو از شعبۂ تالیف و ترجمہ جامعہ عثمانیہ ص ۲۷ و ۹۸

رہے کہ امام کے برخلاف ہونے کا شبہ نہ رہے اور نہ اس سے علیحدگی کا گنہگار ہو (۳) امام کے ساتھ ہمیشہ عقیدتمندانہ مراسم رکھے اور ہمیشہ اسکی اعانت و نصرت پر آمادہ رہے تاکہ مسلمانوں کو غیروں پر شوکت و دبدبہ حاصل ہو (۴) حقوق دینیہ کے عقود، احکام اور فیصلے نافذ رکھے نہ کسی فساد کی بناپر عقود کو باطل کرے اور نہ معاہدات کو کسی خلل کی بنا پر بیکار ٹھہرائے (۵) شرعی محاصل کی وصولی اس طرح کرے کہ ادا کرنیوالے اپنے فرض سے سبکدوش ہو جائیں اور لینے والوں کو جائز ہو جائے (۶) حدود کو شرعی حقوق کیلئے ایسے لوگوں پر جاری کرے جو ان کے واقعی مستوجب ہیں (۷) دین کا حافظ و ناصر اور ممنوعات شرعیہ سے محترز رہے۔

پانچویں صدی ہجری میں جب امارت نے سلطنت کی شکل اختیار کر لی اور سلطان و خلیفہ کے اختیارات کے حدود مقرر ہو گئے تو یہ سوال پیدا ہو کہ خلافت کی اندر سلطنت کا وجود جائز ہے یا نہیں؟ سب سے پہلے اس مسئلہ پر نظام الملک طوسی نے جو سلطان ملکشاہ کا وزیر اعظم تھا اپنی تصنیف "سیاست نامہ"، میں اظہار خیال کیا۔ وہ خود اس نظام کو مستحکم کرنیوالوں میں شامل تھا اسلئے اسنے اس غیر اسلامی نظریے کو سند جواز عطا کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اس کے نزدیک خلیفہ کی موجودگی کے باوجود سلطان کا ہونا ضروری ہے۔ وہ اس کے دنیوی اختیارات کو خلیفہ کا عطیہ نہیں بلکہ براہ راست خدا کا عطیہ سمجھتا ہے اس لئے "وہ سلطان"، کو مامور من اللہ سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک سلطان نہ خلیفہ کو جواب دہ ہے نہ رعایا کو۔ خلیفہ مذہبی معاملات کیلئے مامور ہے اور سلطان دنیوی معاملات کیلئے۔ قضا و قاضی وغیرہ پر خلیفہ اور سلطان دونوں کی

کی اطاعت لازم ہے اس لئے کہ ایک طرف تو وہ خلیفہ کے مذہبی معاملات میں نائب ہیں اور دوسری طرف چونکہ ان کو سلطان نے مقرر کیا ہے اس لئے وہ سلطان کے بھی تابع ہیں اس لئے چونکہ خلیفہ اور سلطان کے حدود الگ الگ ہیں تو دونوں ایک دوسرے سے آزاد اور براہِ راست خدا کے سامنے جواب دہ ہیں۔ رعایا کے سامنے جوابدہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اگر سلطان عادل ہے تو رعایا کی نیکیوں کا نتیجہ ہے اور ظالم ہے تو ان کی بداعمالیوں کا ثمرہ سلطان کے ظلم کا بدلہ خدا دیگا لیکن رعایا کو بغاوت کرنے کا کوئی حق نہیں کیونکہ منشائے الٰہی یہی ہے کہ ان کے اعمال کی سزا رعایا کو اسی طرح دی جائے۔

امام غزالیؒ نے بھی اس مسئلہ پر کافی بحث کی ہے اور سلطنت کے نظام کی تائید کی ہے لیکن آپ نے نظام الملک کی طرح نظام سلطنت کو بذاتِ خود جائز نہیں کیا بلکہ بدرجۂ مجبوری اگر کوئی ظالم سلطان اپنی حربی قوت کی بنا پر استحکام حاصل کرلے اور اس کا معزول کرنا آسان نہ ہو تو اس کی اطاعت آپ کے نزدیک جائز ہے کیونکہ عدم اطاعت کی حالت میں امن اور سکون ختم ہو جائے گا اور تمام ملک میں فساد اور خونریزی کا دور دورہ ہو جائے گا۔ اور نفع کی ہوس میں سرمایہ بھی ہاتھ سے جائیگا اس لئے آپنے ہر اس آزاد حکمراں کو سلطان تسلیم کرنے پر زور دیا ہے جو خطبے اور سکے میں خلیفہ کا اقتدار تسلیم کرلے اس حالت میں اس کے احکام اور فیصلے جائز تصوّر ہوں گے۔

بہرحال بعض ناگزیر حالات میں کسی امیر یا سلطان کی طوعاً و کرہاً اطاعت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اسلام خلافت و سلطنت یا بذاتِ خود سلطنت کے نظام کی اجازت دیتا ہے۔ اسلام واضح طور سے ایک وقت میں ایک قلمرو کے اندر صرف ایک امیر کی اطاعت کا حکم دیتا ہے۔

اسلام کا معاشی نظام

عصرِ حاضر کے معاشی مسائل

عہدِ جدید کے پیدا کردہ مسائل میں سب سے مشکل اور اہم مسئلہ "معاشیات" کا ہے ویسے تو کیونکہ انسانی زندگی کا حصول و تلاش معاش سے گہرا تعلق ہے اس لئے ہر عہد اور ہر ملک میں اسی مسئلہ کو خاص اہمیت حاصل رہی ہے لیکن جس قدر غیر معمولی اہمیت اس کو آج کل حاصل ہے اس کی مثال کسی زمانے میں نہیں ملتی۔ معلوم ہوتا ہے علم و حکمت کی بلند پروازیاں جس قدر بڑھتی جاتی ہیں اسی قدر انسانی مشکلات میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ انسان نے فطرت کے رازدار بننے کی کوشش تو کی اور بڑی حد تک کامیابی بھی حاصل کی لیکن اخلاقی اور روحانی قوانین فطرت سے یکسر اغماض برتنے اور انسانی فرائض سے کُلی اعراض کے باعث اس کے نتائج سے صحیح فائدہ نہ حاصل کر سکا۔ یہ اسی ذہنی خلفشار کا نتیجہ ہے کہ سائنس کے حیرت انگیز انکشافات انسانی آرام و مسرت میں اضافہ کرنے کی بجائے اس کے خرمنِ عیش و امن پر بجلی بن کر گر رہے ہیں ؎

وہ فکرِ گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو
اسی کی بے تاب بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ

سائنس کی ایجادات نے تجارتی اور صنعتی انقلاب تو پیدا کر دیا اور مشینوں کے ذریعے پیداوار کے نئے نئے طریقے اور استعمال بھی بتا دیئے لیکن اس طرح سرمایہ دار، مزدور، کسان و زمیندار، خام اشیاء کی منڈیوں اور صنعتی ممالک کے باہمی تعلقات اور

اسی قسم کے دوسرے پیدا شدہ مسائل کا کوئی حل جدید مفکرین کے پاس نہ تھا اس لئے عوام کے انتشار و ابتلا میں کمی ہونے کی بجائے ان کی زندگیوں کی الجھنوں میں برابر اضافہ ہی ہوتا رہا ہے

گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما لیکے آئی ہے مگر تیشۂ فرہاد بھی ساتھ

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت تمام اقوام و ممالک کی حکومتیں اپنے اپنے مقامی معاشی حل کی تلاش میں سرگرداں ہیں اور تمام دنیا کے مفکرین ایسے حل کی تلاش میں ہیں جو سوسائٹی کے مختلف طبقات میں باہمی توازن پیدا کر سکے، کسی طرح طبقاتی جنگ مفقود ہو جائے اور انفرادی آزادی برقرار رہے۔ بین الاقوامی صلح و جنگ اور امن و آشتی کا انحصار صرف اسی نقطۂ معاشیات پر ہے۔ غرضیکہ اسوقت تمام دنیوی مسائل صرف اسی مسئلہ پر مرکوز ہو کر رہ گئے ہیں پھر بھی جس طرح علمائے اقتصادیات کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑ رہا ہے وہ کسی تشریح کا محتاج نہیں۔

معاشی حیثیت سے تمام دنیا آج کل دو نظریات میں تقسیم ہو چکی ہے۔ ایک سرمایہ داری کا نظام جس کی امامت کا سہرا امریکہ کے سر ہے اور دوسرا نظریۂ اشتراکیت۔

(۱) نظام سرمایہ داری

"انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا" میں "سرمایہ داری" کی حسب ذیل تعریف کی گئی ہے:-

"سرمایہ اس دولت کا نام ہے جو مزید دولت پیدا کر سکے اور جو نظام اس طریق کار کو چلائے وہ نظام سرمایہ داری کے نام سے موسوم ہے"

اس نظام کی خصوصیت یہ ہے کہ انفرادی حیثیت سے ہر شخص جس طرح اور جس قدر چاہے دولت پیدا کر سکتا ہے۔ بنکنگ سسٹم پر جس کا تمام کاروبار

سودی لین دین سے چلتا ہے اِس نظام کی بنیاد قائم ہے۔

بنک بلا لحاظ اس کے کہ تجارت میں نفع ہو یا نقصان اپنی معینہ شرح پر کاروبار چلانے، کارخانہ قائم کرنے اور دوسری ضروریات کے لئے معقول ضمانت پر روپیہ قرض دیتے ہیں۔ جب تک تجارتی گرم بازاری رہتی ہے اور پیدا شدہ سامان کی مارکٹ میں مانگ رہتی ہے بنک بے دھڑک قرضہ دیتے ہیں لیکن جونہی کساد بازاری شروع ہوتی ہے اور سامان کی قیمت گرنے لگتی ہے، منڈیوں میں سامان کی طلب کم ہو جاتی ہے بنک قرض سے ہاتھ کھینچنے لگتے ہیں اور پچھلا قرضہ وصول کرنا شروع کر دیتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کارخانوں میں کام کم ہونے لگتا ہے مزدور بے کار ہو جاتے ہیں اور بے اطمینانی اور بے روزگاری عام ہونے لگتی ہے عوام کی قوتِ خریداری گرنے لگتی ہے کارخانوں اور کھیتوں میں پیدا ہونے والا سامان مانگ کم ہونے کی وجہ سے بے کار پڑا رہتا ہے۔ اور بسا اوقات اس کو ضائع کرنا ضروری ہوتا ہے کہ مبادا اس کو مفت تقسیم کر کے عوام کی ضروریات پوری ہو جانے پر مزید خریداری بند ہو جائے۔ ایسی صورت میں نئے مال کے لئے مانگ قائم رکھنے کی غرض سے پرانے مال کا برباد کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ امریکہ میں جس طرح اس قسم کی پیداواروں کو ضائع کیا جاتا ہے وہ تاریخ سرمایہ داری کا ایک عبرتناک باب ہے۔

سا ۱۹۴۱ء میں برازیل قہوہ کی زبردست فصل کو برباد کرنے کے لئے ۲۷ ستائیس لاکھ روپیہ صرف کرنا پڑا۔ فصل اس لئے برباد کرنا ضروری تھی کہ اس کے بغیر نرخ گر جاتے اور مالکانِ فصل کو نقصان برداشت کرنا پڑتا اس لئے زائد فصل کو برباد کرنے کے علاوہ چارہ نہ تھا۔ اب برباد کیسے کیا جائے؟ زمین میں دفن کرنے کے لئے

لاکھوں بیگھے زمین درکار تھی۔ سمندر میں پھینکا گیا تو دُور دُور تک پانی خراب ہو جانے کے علاوہ مچھلیاں مرنے لگیں اس لئے تیل چھڑک کر جلانے کے علاوہ اور کوئی طریقہ نہ تھا۔ اس طرح لاکھوں روپیہ صرف ایک سال کی زائد فصل کو تباہ کرنے میں صرف کرنا پڑا۔ ؎

نیو رکول اور کیلیفورنیا اور بعض دوسرے مقامات پر سنتروں اور دوسرے پھلوں کی کثیر مقدار کی تباہی کی مثالیں عین اسوقت ملتی ہیں جبکہ انہی مقامات پر مزدوروں اور کسانوں کی لاکھوں کی تعداد فاقہ کشی اور قلت غذا کی شکار تھی۔

ایک طرف ان بے شمار مزدوروں اور کسانوں کی ناگفتہ بہ حالت کا تصور کیجیئے جو جنگلوں، کھیتوں، کارخانوں اور کانوں میں اب بھی جب کہ بہ تنظیم کی وجہ سے ان کو کافی مراعات مل چکے ہیں غلاموں کی طرح کام کرنے اور جانوروں کی طرح زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں اور دوسری طرف غذائی اور دوسری ضروری اشیاء کی بربادی پر غور کیجیے۔ انسانی خود غرضی اور اسی قسم کے وحشیانہ طرز عمل کی مثال شائد زمانہ قدیم میں بھی مشکل ہی سے مل سکے۔

کارلائل کا یہ جملہ اس ظالمانہ نظام کی کس قدر صحیح تصویر ہے:-

"کارخانے دار اپنی بیس لاکھ قمیصوں کیلئے چلا رہے ہیں جن کیلئے کوئی گاہک نہیں اور بیچارے بیس لاکھ مزدور اپنی کمر چھپانے کے لئے جن کے لئے کوئی قمیص نہیں"

(کارلائل ماضی اور حال)

؎ لاطینی امریکہ از جان گنتھر ص ۳۱۵

اس بے اعتدالی کا سبب یہ ہے کہ کارخانہ دار اور ترقی دینے والے بینک دونوں میں کسی کے سامنے قومی بہبود یا عوام کی بہتری کا کوئی سوال نہیں رہتا۔ اِن کا نصب العین نفع اندوزی اور فراہمی سرمایہ کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس لئے باہمی محبت اور اخوت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس نظام کی خصوصیت یہ ہے کہ امراء کی امارت اور مزدوروں کے افلاس میں ہمیشہ اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ آج کل تمام سرمایہ دارانہ ممالک میں بظاہر جمہوری حکومت ہے۔ لیکن حکومت پر دراصل جمہور کا کہیں قبضہ نہیں۔ جمہوریت کے پردے میں دیو استبداد اسی طرح پاکوب ہے۔ سرمایہ داروں کی مٹھی بھر جماعت ہر جگہ عوام پر حکمران ہے۔ عام انسان بے شک اپنی رائے سے اپنے آقا منتخب کرنے لگے مگر خواجگی کا فرسودہ نظام اسی طرح قائم ہے۔ مزدوروں کی حالت اسی طرح ابتر ہے اور اگر کوئی مزدور جماعت برسرِ حکومت آئی بھی تو سرمایہ داری کے نظام کی مستحکم بنیادوں کو ہلانے میں ناکام رہی اور رفتہ رفتہ خود بھی اس کا جزو بن گئی ؎

زمام کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریق کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

(۲) اشتراکیت

اس تحریک کے بانی کارل مارکس نے سرمایہ داری کے غلط نتائج کو محسوس کیا اور ان اسباب کو بھی جانچا جن پر اس نظام کی اساس قائم ہے۔ لیکن مرض کو دور کرنے کے لیے جو نسخہ تجویز کیا اس نے انسانی آلام کو کم کرنے کے بجائے ان میں اور الجھنیں پیدا کر دیں۔ کارل مارکس نے جس کو تحریکِ اشتراکیت میں "پیغمبر بے جبریل" کی حیثیت حاصل ہے اور جس کی کتاب "سرمایہ" کو اشتراکیوں میں وہی پوزیشن حاصل ہے جو عیسائیوں میں بائبل کو۔ تجویز کیا کہ دولت پیدا کرنے کے تمام ذرائع کو انفرادی ہاتھوں

سے نکال کر حکومت کے قبضے میں دے دیا جائے، افراد اپنی قوت و استعداد کے مطابق کام کریں اور حکومت کے پروگرام کو چلائیں اور حکومت ان کی ضروریات کی کفیل ہو۔ انفرادی سرمایہ یا جائداد کسی شکل میں بھی جائز نہ رکھا گیا۔ سرمایہ دارانہ نظام اور طبقاتی مراتب کے امتیاز کو ختم کرنے کے لئے اس نے سکے اور "زر" کی ہر شکل کو انفرادی استعمال کے لئے ممنوع قرار دیا اور اس کے بجائے "بلے زر معاشیات" MONEYLESS ECONOMICS کو رائج کیا جس کی رُو سے ہر شخص اپنی ضروریات کے مطابق حکومت کی دوکانوں سے کپڑا اور کھانے کا راشن حاصل کرے۔ اس نے زندگی کی معمولی ضروریات کیلئے طبقاتی امتیاز کو ختم کر دیا۔ اور "مساوات شکم" کے نظریئے پر تحریک کی بنیاد رکھی ؎

دین آں پیغمبر ناحق شناس   بر مساوات شکم دارد اساس

چونکہ مارکسی نظریئے کے مطابق انسانی نصب العین صرف پرورشِ جسم شکم پُری اور حصولِ معاش ہے اور انسانی مصائب و آلام کا سبب محض دولت کی غلط تقسیم ہے اس لئے اس نظام میں مذہب و عبادت اور حیات بعد الممات کے عقیدے کی ضرورت ہی نہیں اشتراکیت کی اساس ہی "لا کلیسا، لا سلاطین، لا الٰہ" کے پروگرام پر قائم ہے ؎

روسیاں نقشِ نوے اندا ختند   آب و ناں بردند و دیں درباختند

یہ نظام بظاہر جس قدر دلکش اور خوشنما معلوم ہوتا ہے اسی قدر غیر فطری اور ناقابل عمل ہے۔ اس کے ناقابلِ عمل ہونے کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ اس میں انسان کی انفرادی حیثیت، اس کا تشخص اور اس کی خودی بالکل ختم ہو جاتی ہے اس میں انسان اپنے مخفی صفات و استعداد کو جن کو قدرت نے اس کے اندر خاص

طور سے ودیعت کیا ہے ترقی دینے کی کوئی گنجائش نہیں۔ انسان کی فطرت ہے کہ وہ اپنی محنت، دماغی کاوشں اور دنیوی جدوجہد سے حاصل کردہ سرمائے سے اپنی منشا کے مطابق فائدہ حاصل کرے اور اپنی صلاحیتوں سے خود بھی فائدہ اٹھائے، اپنے عزیز و اقارب اور قوم کے دوسرے افراد کو بھی فائدہ پہنچائے لیکن اس نظام کی بندشوں میں جکڑے ہوئے انسانوں کو یا تو صحرا کے جانوروں کی طرح یا دل ناخواستہ کام پر لگانے کے لئے جور و استبداد سے کام لیا جائے یا چمن کے پودوں کی طرح ان کا پلاننگ کیا جائے۔ اس کے لئے ایک زبردست اور بدترین قسم کی ڈکٹیٹر شپ کی ضرورت ہے جو عوام کو اس ظالم پروگرام کی زنجیروں میں جکڑ کر رکھ سکے۔ آج روس میں مزدور برائے نام آزاد ہے ورنہ اسٹالین کی آمریت مسولینی اور چنگیز خان کی ڈکٹیٹر شپ سے کم نہیں۔ روسی عوام میں قوت عمل کے جذبے کی محرک مارکسی تحریک نہیں بلکہ ملکی اور قومی استحکام کا خیال ہے وہاں مزدور آمریت (DICTATORSHIP OF THE PROLETERIATE) جو مارکسی تحریک کا بنیادی اصول تھا۔ اب کوئی امکان ہے نہ اس کے لئے کوئی جدوجہد پائی جاتی ہے۔ درحقیقت اس میں اب کوئی مارکسی نظام کی علامت بھی باقی نہیں ہے۔ وہاں اب خالص قومی اور ملکی حکومت قائم ہے اور اس حکومت کی پالیسی اس طرح سرمایہ دارانہ اور ملوکیت پر ہے جیسی کہ امریکہ اور انگلینڈ کی گزشتہ جنگ اور اس کے بعد کے حالات نے اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں چھوڑی۔ جرمنی کے خلاف روسی اگر اپنے خون کا آخری قطرہ بہانے پر تیار تھے تو وہ محض اپنی قوم و وطن کے دفاع و بقا کے لئے نہ کہ مارکسی نظریہ حکومت کے لئے — امریکہ اور انگلینڈ جیسی سامراجی طاقتوں کے ساتھ روس کا معاہدہ اس بات کا پہلا ثبوت تھا کہ وہاں کوئی نظری تحریک باقی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں کے عوام و خواص پر خود ان کی ملکی حکومت

نے جس قدر مظالم توڑے ہیں اس کی مثال مشکل سے کسی دوسرے ملک میں مل سکے گی۔ غیر جانبدار مؤرخین کے بیان کے مطابق ان مقتولین کی تعداد جو صرف اپنے سیاسی عقائد کے اختلاف کی بنا پر موت کے گھاٹ اتارے گئے اٹھارہ لاکھ ساٹھ ہزار ہے جس میں ۲۸ بشپ، ۱۲۰۰ بارہ سو پادری، چھ ہزار پروفیسر، آٹھ ہزار آٹھ سو ڈاکٹر، ایک لاکھ بانوے ہزار مزدور اور آٹھ لاکھ پندرہ ہزار کاشتکار شامل ہیں۔ ۱؎

ڈبلیو۔ ایچ۔ چیمبرلین۔ جو روس میں ۱۹۲۲ء سے ۱۹۳۴ء تک کرسچین سائنس مانیٹر کے نمائندے کی حیثیت سے مقیم تھا اپنی کتاب "روس کا آہنی دور" صفحہ ۱۵۱ میں لکھتا ہے کہ "روس میں ایسے شہریوں کی تعداد جو بغیر کسی قانونی کارروائی کے اپنی آزادی سے محروم کئے گئے بیس لاکھ سے کم نہیں ہے۔" ان مقتولین میں صرف وہی لوگ نہیں ہیں جو مارکسی نظام سے اختلاف رکھتے تھے بلکہ ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں ایسے افراد بھی شامل ہیں جو اس نظام کے حامی اور دلدادہ تھے اور ان میں ٹراٹسکی۔ زینوف۔ بوریزوف جیسے پختہ مارکسی لیڈر بھی شامل ہیں جو اس تحریک میں اسٹالین سے کم حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ ان اعداد و شمار سے ان مصائب و مظالم کا ہلکا سا اندازہ ہو سکتا ہے جو اس نظام کے نافذ کرنے میں روسی عوام کو برداشت کرنے پڑے ہے

قیاس کن زگلستان من بہار مرا

باوجود ان شدید مظالم اور قتل و خون کے مارکسی نظام اس قدر غیر فطری اور ناقابل عمل بنیادوں پر قائم تھا کہ ابھی تحریک اپنے قرن اول سے بھی نہ گزرنے پائی تھی کہ اسکی تمام آہنی زنجیریں خود بخود شکستہ ہو کر گر پڑیں۔ آج جس حیثیت سے اشتراکیت

۱؎ اسلامی اقتصادیات الشیخ محمد احمد صفحہ ۸

روس میں نافذ ہے اور مستقبل قریب کی جو شکل سامنے دکھائی دے رہی ہے اس کو کسی نظری تحریک سے تعبیر کرنا محض ایک فریب ہے آج روس میں آمریت اس طرح کارفرما ہے جیسے عہد قدیم میں ملوکیت۔ نہ اس نظام میں پرائیویٹ دولت پر کوئی پابندی ہے نہ طبقاتی امتیاز کا وہ فقدان اور نہ "بے زر معاشیات" کی کوئی اسکیم یہی اس تحریک کے بنیادی ستون تھے۔ ابتدا تحریک میں خرید و فروخت، مارکٹ اور مبادلے کے انسداد کا جو طریقہ "بے زر معاشیات" اسکیم کے ماتحت نافذ کیا گیا اور جس کی رُو سے، ہر شخص اپنی ضرورت کے موافق راشن حکومت سے حاصل کر سکتا تھا اور اسی لئے بازاری خرید و فروخت کی ضرورت نہ تھی۔ چند سال بھی کامیابی کے ساتھ نہ چل سکا اور تھوڑے ہی عرصہ کے بعد "ربال"[1] (RUBLE) کو دوبارہ چلانا پڑا۔ اب تبادلۂ اشیا اور مبادلہ کا وہی طریقہ روس میں جاری ہے جیسے دوسرے سرمایہ دار ممالک ہیں۔ اس کو دوبارہ نافذ کرنے کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ کھیتوں اور کارخانوں کے مزدور خوش انتظامی اور عمدگی سے کام کرنے سے دل چراتے تھے کیونکہ ان کو سب ضروریات مساوی حیثیت سے مل جاتی تھیں۔ ایک بے وقوف اور ذہین کام کرنے والے میں کوئی امتیاز نہ تھا۔ آخرکار حکومت کو مجبور ہو کر طے کرنا پڑا کہ مزدوری کام کے مطابق دی جائیگی۔ اس طرح لازم ہوا کہ "سکہ زر" پھر نافذ کریں۔ یہ ایک بنیادی تنسیخ جو مارکسی پروگرام میں کی گئی اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ انفرادی سرمایہ کو جائز تسلیم کیا جاتا کیونکہ سرمایہ "زر" کی شکل میں تبدیل ہوتے ہی اضافۂ سرمایہ کا موجب ہو جاتا ہے۔ چنانچہ روس میں اب نہ صرف نجی سرمایہ کی ایک غیر محدود مقدار تک اجازت ہے بلکہ روسی بنک جمع شدہ

---

[1] قیمت میں پانچ ربال تقریباً ایک روپیہ کے برابر ہوتا ہے۔

انفرادی سرمائے پر سود بھی دیتے ہیں۔

جون گنتھر اپنی کتاب "اندرونِ یورپ" میں روس کے متعلق لکھتا ہے:۔

"کسی پر سرمایہ جمع کرنے کی کوئی حد یا پابندی نہیں ہے لیکن اس اندوختہ سرمایہ کو کاروبار میں لگانے کا کوئی ذریعہ سوائے حکومت کے قرضناموں کے نہیں ہے اور یہ بنک دوسرے سرمایہ دار ممالک کی طرح ان قرضوں پر سود ادا کرتا ہے اور کافی مقدار میں یعنی آٹھ ۸ فی صدی سیونگ بنک کی خاص طور سے ہمت افزائی کی جاتی ہے اور ۱۹۳۵ء میں روپیہ جمع کرنے والوں کی تعداد پورے یونین میں چار ۴ کروڑ تیس ۳۰ لاکھ تھی وہاں بنک آٹھ ۸ سے دس ۱۰ فی صدی شرح تک سود دیتے ہیں۔" [۱]

نجی سرمایہ پر کوئی پابندی نہ ہونے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ طبقاتی امتیازات روس میں آج اسی طرح اگرچہ مختلف ناموں کے ساتھ قائم ہیں جس طرح دوسرے ممالک ہیں

"اسلامی اقتصادیات" کے مصنف نے ایک فرانسیسی کمیونسٹ کامریڈ یون (COMRADE YVON) کی شائع کردہ ماہانہ آمدنی کو مندرجہ ذیل اعداد نقل کئے ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مارکس اور لینن کے تخیلات کے خلاف کس قدر طبقاتی امتیاز روس میں پیدا ہو چکا ہے۔

---

[۱] "اندرونِ یورپ" از جان گنتھر ص ۵۱۱

	کم سے کم	زیادہ سے زیادہ
مزدور۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔	۸۰ ربال	۴۰۰ ربال
معمولی ملازم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔	۸۰ "	۴۰۰ "
ذمہ وار حکام اور منتظمین اور پروفیسر وغیرہ	۱۵۰۰ "	۱۰،۰۰۰ "

کمریڈیون کے بیان کے مطابق روس میں آمدنی کا فرق ۲۵ ربال سے لے کر ۳۰،۰۰۰ ربال تک ہے یعنی کم از کم تنخواہ ۲۵ ربال ہے اور زیادہ سے زیادہ ۳۰،۰۰۰ ربال۔

اس میں کوئی شک نہیں روس میں زمیندار کسان اور مزدور و کارخانہ دار کی تقسیم ختم ہو چکی ہے کیونکہ دولت پیدا کرنے کے تمام ذرائع پر حکومت کا قبضہ ہے لیکن یہ انسانی امتیاز دوسرے ناموں سے موجود ہے کہیں مینجروں۔ انجینئروں اور کہیں مختلف قسم کے مزدوروں اور پروفیسروں کے ناموں سے ۔

می تراشد فکر ما ہر دم خداوندے دگر   رست از یک بند تا افتاد در بند دگر

یہ صحیح ہے کہ جدید روس میں عوام بے روزگار نہیں ہیں اور ان کی شکم پری کا پروگرام کامیابی سے چل رہا ہے۔ لیکن یہی اگر انسان کی معراج ہے تو اس سے زیادہ آسانی کے ساتھ سائبیریا کے صحرا میں رہنے والے جانوروں کی شکم پری ہو جاتی ہے۔ انسان اور حیوان میں بھی کوئی امتیاز اور ان کے نصب العین میں کوئی اختلاف ہے یا نہیں؟

اس پیٹ بھرنے کے عوض میں جس طرح آہنی نظام میں اسیر ہو کر اور انفرادیت اور انسانیت کو ختم کر کے روسی عوام نے سودا کیا ہے وہ یقیناً بہت

لل ہے اولٰئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ

نیشنل سوشلزم

جرمنی نیشنل سوشلسٹ پارٹی کے سیاسی اور معاشی پروگرام کو ہٹلر کے حکم سے ڈاکٹر گوٹفرائڈ فیڈر (GOTTFRIED FEDER) نے ۱۹۲۷ء میں باضابطہ طور سے مرتب کیا جو کتابی شکل میں "ہٹلر کا سرکاری پروگرام" کے نام سے موسوم ہے۔ یہ پروگرام ۲۵ نکات پر مشتمل ہے جو سب سے پہلے ۲۵ فروری ۱۹۲۰ء کو میونخ سے اور پھر ۶ مارچ ۱۹۳۰ء کو پارٹی کے منشور کی حیثیت سے میونخ سے نشر کیا گیا۔

پورا پروگرام اس نظریہ پر مبنی ہے کہ جرمن نسل دوسری نسلوں پر فوقیت رکھتی ہے اسلئے اس کا مطمحِ نظر صرف جرمن قوم کی فلاح و بہبود ہے۔ غیر جرمن نسل کے کسی فرد کے لئے کوئی ترقی کا موقعہ اس پروگرام کی رو سے روا نہیں رکھا گیا۔ پروگرام کی ابتدائی دس دفعات کا مقصد محض جرمن نسل کی حفاظت اور ان کے شہری حقوق کا تحفظ ہے۔

اس پروگرام کے مرتب نے اس کی تشریح میں ایک علیحدہ پمفلٹ "پروگرام کی تفصیلی ضروریات،" کے عنوان سے اصل کتاب "ہٹلر کا سرکاری پروگرام" میں شامل کیا ہے جو تقریباً ۳۱ دفعات پر مشتمل ہے۔ اصل پروگرام اور اس کی تشریحی دفعات میں بہت واضح طور سے اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ جرمن نسل کے علاوہ اور کوئی شخص جرمن اسٹیٹ کا رکن یا جرمن شہری نہیں بن سکتا۔ اگر کوئی فرد جرمن حکومت کے سیاسی اور معاشی پروگرام کو تسلیم کر لے اور جرمنی میں مستقل رہائش اختیار کر لے تب بھی وہ صرف مہمان کی حیثیت سے غیر ملکی قوانین کے ماتحت رہ سکتا ہے۔

(دفعہ ۵) حق رائے دہندگی۔ ملازمت اور ہر قسم کے عہدے صرف جرمن نسل کے افراد کے لئے محفوظ کر دیئے گئے (دفعہ ۶) جرمن نسل کا ہر فرد خواہ دنیا کے کسی حصہ میں رہتا ہو جرمن اسٹیٹ کا شہری تصور کیا جاتا تھا۔

حیرت یہ ہے کہ باوجودیکہ پارٹی کے پروگرام کی دفعہ ۲۴ کی رو سے اسٹیٹ کا مذہب اثباتی عیسائیت (POSITIVE CHRISTIANITY) ہے لیکن پھر بھی غیر جرمنی عیسائی خواہ وہ صدیوں سے جرمنی میں رہتا ہو اس کا شہری نہیں بن سکتا۔ صرف یہی نہیں بلکہ دفعہ ۷ اور ۸ کی رو سے غیر جرمن باشندوں کو بالخصوص ان لوگوں کو جو ۲۰ر اگست ۱۹۱۴ء کے بعد جرمنی میں پہنچے ہوں باہر نکل جانے کا حکم ہے اور مزید غیر جرمن افراد کا داخلہ بند ہے۔ نیشنل سوشلزم کا سیاسی پروگرام کسی جمہوری پارلیمنٹری اصول پر مبنی نہیں ہے بلکہ اس کے خلاف اعلان جنگ ہے۔ اس پروگرام میں آمریت آہنی طور سے اپنی پوری خصوصیات کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے۔ پروگرام کی تشریحی دفعات مرتبہ گوٹفرائڈ کی دفعہ ۳۹ میں اس اصول کو بہت واضح طور سے بیان کر دیا گیا ہے کہ حکومت کا اقتدار اعلیٰ صرف ایک مطلق العنان حکمران (فیورر) کی ذات میں مرکوز ہوگا خواہ یہ مرکزی طاقت ایک منتخبہ بادشاہ کی وارث ہو یا صدر کی اس کا فیصلہ جرمن قوم کے اختیار میں ہوگا۔ چنانچہ عملی حیثیت سے ہٹلر کی ذات حکومت کے تمام اختیارات و مظاہرات کا مرکز تھی اور اسی کا حکم آخری حکم تھا جس کے خلاف سرتابی تو کیا اس پر نکتہ چینی بھی بغاوت کے مترادف تھی۔ اس نظام میں آزادی رائے اور آزادی مذہب کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ان تمام حقائق کو مذکورہ پروگرام میں واضح طور سے بیان کر دیا گیا تھا چنانچہ پروگرام کی دفعہ ۲۴ اور تشریحی نوٹ کی دفعہ

۲۲ اور ۲۳ کی رو سے کوئی مذہب، تمدن، آرٹ یا اخبارات یا کسی قسم کا ذریعہ نشر و اشاعت نافذ نہیں ہو سکتا جو جرمن نسل کے تخیلات اور اخلاقی ضابطے کے خلاف ہوں۔

جہاں تک نازی معاشی پروگرام کا تعلق ہے وہ یقیناً" مارکسی کمیونزم سے بہت بہتر قابل عمل اور زیادہ مفید ہے۔ اس کے خاص خاص نکات یہ ہیں۔

۱۔ ذاتی سرمایہ اور انفرادی ملکیت کو تسلیم کیا گیا ۲۔ دولت کو چند ہاتھوں میں محدود ہونے سے روکنے کے لئے بے جا منافع جات یعنی اس قسم کی نفع اندوزی جس میں ذاتی محنت نہ کی گئی ہو بالخصوص جنگ کے زمانے میں جمع کردہ منافع جات ممنوع قرار دیئے گئے۔ ۳۔ سودی کاروبار حتیٰ کہ بنک کے سودی لین دین کو قطعی ممنوع قرار دیا اور پروگرام کے دفعہ ۱۴ کی رو سے سود اور بے جا نفع اندوزی کی سزا موت مقرر کی گئی ۴۔ جاگیرداری اور بڑی بڑی زمینداریوں کو ختم کر کے زمینوں کو مستحق کاشتکاروں کے قبضہ میں دے دیا گیا۔ زمین کی پیداوار کے مالک وہی لوگ قرار دیئے گئے جو خود اس میں کاشت کرتے ہوں۔ لیکن ان کا انتقال آراضی کا حق بہت محدود تھا اور حکومت کو شفعہ کا حق تھا اس طرح زمین دراصل حکومت یا پوری قوم کی ملک قرار دی گئی۔ جس سے محنت کر کے فائدہ اٹھانے کا حق کاشتکار کو دے دیا گیا۔ جو وراثتاً منتقل ہو سکتا تھا۔ ۵۔ زمینوں پر سرکاری محصول پیداوار کے لحاظ سے مقرر کیا گیا ۶۔ تمام بنکوں کو سرکاری ملک میں لے لیا گیا ۷۔ کاشتکاروں۔ تاجروں۔ کارخانہ داروں اور دوسرے ضرورتمندوں کو بجائے سود پر قرض دینے کے مشارکت کے اصول پہ قرضہ دینا طے کیا گیا۔ ۸۔ تمام بڑے بڑے سرمایہ دار تجارتی اور صنعتی اداروں پر قبضہ کر لیا گیا ۹۔ ہر جرمن کے لئے ایک سال لازمی کام کے لئے مقرر کیا گیا۔

مثلاً ہر اس شخص کو جو اپاہج یا ناکارہ ہو یا بڑھاپے کی وجہ سے بے کار ہو گیا ہو ایک معینہ آمدنی کی ضمانت کا اعلان کیا گیا۔

سود کی ممانعت، جاگیرداری نظام کو ختم کر کے زمین کو حکومت کی ملک قرار دینا، زمین کی پیداوار کے مطابق اس پر ٹیکس مقرر کرنا، بنکوں پر سرکاری قبضہ کر لینا، اور سود کے بجائے نفع کی شرکت بنا پر روپیہ قرض دینا اور اس پروگرام کے کئی دوسرے دفعات اسلامی پروگرام سے بہت مماثلت رکھتے ہیں۔ البتہ ایک سرسری نظر ڈالنے سے اس پروگرام میں ایک کمی ضرور پائی جاتی ہے وہ یہ کہ سرمایہ جمع کرنے کی نہ کوئی حد مقرر ہے نہ سرمایہ پر کوئی ٹیکس ہے جس طرح اسلام میں زکوٰۃ اس طرح اندوختہ سرمایہ کے گھٹنے اور غیر سرمایہ دار افراد میں اس دولت کے پہنچنے کا کوئی ذریعہ نہیں۔

اسلامی پروگرام

اسلام کے نزدیک معاشی مسئلہ اس قدر اہم اور پیچیدہ نہیں ہے جیسا کہ دورِ حاضرہ کی اور حکومتوں اور ملکوں میں سمجھا جاتا ہے اور جس کے حل کرنے کے لئے سوشلزم اور کمیونزم جیسی تحریکوں کو جنم لینا پڑا۔ دراصل معاشیات کا مسئلہ اسلام میں بذاتِ خود اور علیحدہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ اسلام انسان کے انفرادی اور اجتماعی زندگی کے نظام کا نام ہے جس میں سیاست و مذہب، معاشرت و معیشت، اخلاق و تمدن ایک دوسرے کے ساتھ اجزاء لاینفک کی طرح مربوط و منسلک ہیں اس کا کوئی ایک جزو دوسرے جزو کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا۔ اس لئے اسلام جس مسئلہ کا حل بھی پیش کرتا ہے وہ فطرتِ

انسانی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس طرح پیش کرتا ہے کہ دین (اسٹیٹ) کا کوئی شعبہ ایک دوسرے سے متصادم نہ ہو اور فرد کی زندگی کا کوئی پہلو حدِ اعتدال سے تجاوز نہ کر سکے اس نظام کی بنیاد اخلاق و روحانیت پر ہے۔ زمین پہ انسانوں کا باہمی محبت اور امن سے زندگی بسر کرنا جدل و قتال اور فتنہ و فساد سے پرہیز اور حق و عدل کا قیام اسلام کے نزدیک انسان کے اہم ترین فرائض میں داخل ہیں۔ اس لئے اسلامی نظام کا قیام اسی مقصد کے حصول کا ایک ذریعہ ہے۔ اسلامی اسٹیٹ کا یہ فرض ہے کہ وہ ہر فرد کو زمین پہ ایک صاف ستھری اور پاکیزہ زندگی بسر کرنے کے مواقع بہم پہنچائے۔ کھانے کے لئے سادہ اور اچھی غذا۔ رہنے کے لئے معمولی خوشنما مکان۔ یہ انسان کی معمولی ضروریات ہیں۔ اسلام ایک طرف ہر فرد سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنی فطرت استعداد اور صلاحیت کے مطابق جماعت کے قیام اور نظام حکومت کو چلانے کے لئے کام کرے اور دوسری طرف ہر فرد کو پرامن زندگی بسر کرنے کا حق عطا کرتا ہے یہ اسی وقت ممکن ہے جب سوسائٹی کے مختلف طبقوں میں باہمی اعتدال و توازن قائم رہے ایک طبقہ دوسرے پر غالب ہو کر اس کے ذرائع و وسائل معاش پر قبضہ نہ کر سکے اور اس طرح ایک گروہ اتنی دولت پر قبضہ نہ کرے کہ اس کی ضروریات سے زائد ہو اور دوسرا گروہ اپنی معمولی ضروریات بھی رفع نہ کر سکے اس مقصد کے حصول کے لئے اسلام سب سے پہلے ان اسباب کا سدِّباب کرتا ہے جن سے سرمایہ عوام کے ہاتھوں سے نکل کر مٹھی بھر سرمایہ داروں کے پاس جمع ہو سکے۔

سود کی ممانعت

بغیر کسی ذاتی محنت کے نقد روپیہ کو ایک معینہ شرح پر قرض دے کر دولت پیدا کرنے کا طریقہ اسلام کے نزدیک سب سے زیادہ مذموم اور دولت کو امراء اور سرمایہ داروں کی مٹھی بھر جماعت میں محدود کرنے کا سب سے بڑا سبب ہے اس لئے اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا کہ سرمایہ دار محض اپنی دولت کی بدولت غریبوں اور ناداروں کا خون چوس کر اپنے سرمایہ کو بڑھائیں۔ سودی کاروبار کے مذموم نتائج اسقدر واضح ہیں کہ تقریباً ہر ملک اور سوسائٹی کے ہر دور میں اس کاروبار کو بری نظروں سے دیکھا گیا ہے نہ صرف اہل یونان و روما نے اس قسم کے کاروبار کی مذمت کی اور نہ صرف کلیسائی نظام نے اس طریقۂ کاروبار کو ناجائز قرار دیا بلکہ مشرکین عرب میں بھی باوجودیکہ سود کی رسم بہت عام تھی ان لوگوں کو اچھی نظروں سے نہ دیکھا جاتا تھا جو سود در سود پر روپیہ چلانے کا کام کرتے تھے۔

قرآن کریم نے جس قدر واضح اور غیر مبہم الفاظ میں سود کی ممانعت اور مذمت کی ہے اس کی مثال بہت کم مسائل کے سلسلہ میں ملتی ہے چنانچہ سورہ بقر میں اس طرح وضاحت کی گئی :-

> "جو لوگ سود کھاتے ہیں (قیامت کے دن) کھڑے نہیں ہو سکیں گے
> مگر اس شخص کی طرح جس کو شیطان نے چھپیٹ سے مخبوط الحواس کر دیا ہو۔
> یہ ان کے اس طرح کہنے کی سزا ہے کہ جیسا "بیع" ویسا "سود"، حالانکہ
> تجارت کو اللہ نے حلال کیا ہے اور ربوا کو حرام۔ تو جس کے
> پاس اس کے پروردگار کی نصیحت پہنچی اور وہ باز آئے گا تو جو وہ پہلے

(لے چکا) ہے وہ اس کا ہوچکا اور اس کا معاملہ خدا کے سپرد اور جو ممانعت کے بعد بھی سود لے تو ایسے ہی لوگ دوزخی ہیں اور ہمیشہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔ اللہ سود کو گھٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے اور جتنے ناشکرگزار ہیں اور کہنا نہیں مانتے خدا ان سے راضی نہیں"

اسی سلسلہ میں اسی سورۃ میں پھر حکم ہوا:۔

"اے مومنو! اللہ سے ڈرو اور جو سود (لوگوں کے ذمے) باقی ہے اس کو چھوڑ بیٹھو اور اگر ایسا نہیں کرتے تو پھر اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ لڑنے کے لئے تیار ہو جاؤ اور اگر توبہ کرتے ہو تو اپنی اصلی رقم تم کو پہنچتی ہے) نہ تم کسی کا نقصان کرو اور نہ کوئی تمہارا نقصان کرے اور اگر قرضدار تنگ دست ہو تو اس کو فراغت تک مہلت دو"

اس حکم پر اس قدر سختی کے ساتھ کاربند رہنے کے کئی اسباب ہیں:۔

اوّل یہ کہ سونے اور چاندی کا اصل مصرف اشیاء کے باہمی تبادلہ میں آسانی پیدا کرنا ہے "زر" ذریعہ مبادلہ (MEDIUM OF BXCHANGE) بن سکتا ہے بذاتِ خود دولت میں اضافے کا باعث اس وقت تک نہیں بن سکتا جب تک اس میں ذاتی محنت شریک نہ ہو۔ روپیہ میں دوسرا روپیہ پیدا کرنے کی صلاحیت بذاتِ خود نہیں ہے۔

دوم۔ سود کی مخالفت کا دوسرا سبب یہ ہے کہ یہ طریقۂ کار باہمی اخوت، محبت، نیکی اور احسان کو ختم کرتا ہے۔ سود خور انسان اور جماعتوں میں کمال خودغرضی اور بے رحمی پیدا ہو جاتی ہے۔ دوسروں کی مصیبت اور پریشانی ان کے

اضافۂ دولت کا باعث ہوتی ہے۔ قرضخواہوں کو آسانی سے سود پر قرض حاصل ہو جانے کی وجہ سے ان میں فضول خرچی۔ مذموم رسوم میں اسراف بے جا کی عادت ہو جاتی ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ ان کی تباہی میں رونما ہوتا ہے۔ لیکن ان کی بربادی اور تباہی سود خور کے انسانی جذبات کو ہرگز متاثر نہیں کر سکتی وہ اپنے قرض کا ایک ایک حبہ وصول کرنے کے لئے کسی حربے کو استعمال کرنے سے نہیں شرماتے۔ شکسپیئر کے کے ڈرامے "مرچنٹ آف وینس" میں شائیلاک یہودی کے کردار میں اس حقیقت کا بہترین مظاہرہ ملتا ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی مالی تباہی کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد سے اب تک انگریزی عملداری میں یہاں کے مہاجنوں سے غیر محدود شرح سود پر قرضہ دے کر ان سے پچاس پچاس گنی رقمیں سود در سود کی حاصل کیں اور بسا اوقات ان کی جائدادوں تک پر قبضہ کر لیا۔ ہندوستان میں لاکھوں مسلمان خاندان اسی دستبرد کا شکار بن چکے ہیں۔

سوم۔ سودی کاروبار سے ایک بڑا نقصان یہ ہے کہ سود دہندہ اپنے روپیہ کی بدولت ایک معینہ شرح سود کا مستحق بن جاتا ہے اور قرضدار اس روپیہ کو تجارت یا کسی اور مصرف میں لگا کر نفع اور نقصان دونوں صورتوں کا پابند ہوتا ہے۔ نقصان کی صورت میں ایک فریق کی تباہی لازمی ہے مگر سود دہندہ کو اس سے کوئی سروکار نہیں وہ اپنے مقررہ روپیہ کا مستحق ہے وہ اس کو ضرور لے گا اور کیونکہ قرض دیتے وقت بڑی بڑی ضمانتیں قرض کی لے لی جاتی ہیں اس لئے قرض دہندہ کا روپیہ بہرصورت محفوظ رہتا ہے۔ اس طریقہ سے سوسائٹی میں بے کار ناکارہ سست

مگر مالدار لوگوں کا ایک طبقہ پیدا ہو جاتا ہے جو صرف قرضخواہوں کی محنت اور ان کے کمائے ہوئے سرمایہ سے حاصل شدہ سود پر زندہ رہتا ہے۔ رفتہ رفتہ قرضخواہوں کی کثیر تعداد روز بروز مفلس اور قرض دہندگان کی مٹھی بھر جماعت ہر روز مالدار ہوتی جاتی ہے۔

حیرت یہ ہے کہ سود کی ان ناقابل انکار مضر اور تباہ کن نتائج کے باوجود جدید تمدن میں جس طرح رقص و سرود اور مے نوشی و بے حیائی نے اپنی مسلمہ خرابیوں کی باوجود اجزار لاینفک کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اسی طرح جدید اصول تجارت و محنت میں سودی نظام اس بری طرح چھا گیا ہے کہ تجارتی اور صنعتی سود کے خلاف آواز اٹھانا قدامت پرستی کے مرادف ہو گیا ہے۔ حتیٰ کہ علماء اسلام کی ایک جماعت بنکنگ سود کے جواز کی حامی ہو گئی ہے۔ چونکہ ان لوگوں کی سمجھ میں موجودہ بنکنگ سسٹم ناگزیر ہے اور اس کے بغیر صنعت و تجارت چل ہی نہیں سکتی۔ اس لئے بنک کے ذریعہ سودی لین دین ان کے نزدیک "ربوا" کی تعریف میں نہیں آتا حالانکہ مہاجنی اور بنک کے سود میں سوائے شرح سود کے اور کوئی فرق اس کے علاوہ نہیں کہ اول الذکر صورت میں قرض دہندہ ایک فرد ہے اور دوسری صورت میں افراد کی ایک جماعت۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو نظام سرمایہ داری کی بنیادیں موجودہ بینکنگ سسٹم پر ہیں جس کی طرف اسی عنوان کے ابتدار میں اشارہ کیا جا چکا ہے لیکن ان تمام خرابیوں کے باوجود سوال یہ ہے کہ اگر موجودہ اقتصادی نظام کو ختم کر دیا جائے تو صنعت و حرفت اور تجارت میں روپیہ لگانے کے لئے کیا انتظام کیا جائے؟ بدقسمتی سے ہمارے قدامت پرست علمار کسی نظام کے جواز یا عدم جواز پر

فتوے تو صادر کر سکتے ہیں اور مسائل پر تنقیدی نظر ڈالنے میں وہ کافی مہارت رکھتے ہیں لیکن کسی غیر اسلامی نظام کے مقابلہ میں کوئی اثباتی اور تعمیری پہلو پیش کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ دنیائے اسلام کے کسی ملک کی حکومت یا علماء کی کسی جماعت نے اب تک کوئی مالی نظام جدید اقتصادیات کی روشنی میں مرتب کرنے کی کوشش نہیں کی۔ لیکن اب جب کہ نظام اسلامی کے نفاذ کا جذبہ عام طور سے پیدا ہو چکا ہے اور جب کہ ایک مکمل دستورِ حیات کی طلب و جستجو ہر طرف جاری ہے یہ ناگزیر ہو گیا ہے کہ اسلامی نظام معاشیات کی مکمل اسکیم موجودہ حکومتوں کے سامنے رکھ دی جائے اور مسلم حکومتوں سے اس کا مطالبہ کیا جائے کہ وہ اس کو اپنے اپنے ممالک میں نافذ کریں۔ جہاں تک بغیر سود قرضے کے مسئلہ کا تعلق ہے اس کی دو تین صورتیں ملیں۔

(۱) تجارتی و صنعتی قرضہ (۲) کاشتکاری قرضہ (۳) نجی ضروریات کا قرضہ۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے اسلامی حکومت کو ان تمام اداروں اور بینکوں کو بند کرنا ہو گا۔ جو سودی کاروبار کرتے ہیں۔ سود پر روپیہ لینا اور دینا دونوں صورتوں کو جرم قرار دینا چاہیئے ان نجی اور سرمایہ داروں کے بینکوں کے بجائے حکومت کو خود اپنے دو قسم کے بنک قائم کرنا چاہیئے (۱) امداد باہمی کی بنا پر بغیر سود کے قرضہ (یعنی قرض حسن) دینے والے بنک (۲) تجارتی طور سے شرکت منافع کی بنا پر قرض دینے والے بنک۔ کاشتکاروں یا ضرورتمند اصحاب کو امداد باہمی بینک سے جو در اصل بیت المال کا ایک محکمہ ہو گا بغیر سود قرض ملنا چاہیئے۔ قرض وصول کرنے کے لئے جائداد۔ سامانِ تجارت (اسٹاک) یا فصل کی ضمانت ضرور ہو گی تاکہ وصولیابی

میں وقت نہ ہو۔ اسی سے حکومت قرضدار کی فلاح و بہبود کی خواہاں ہوگی۔ اس کیلئے حکومت کو فاضل سرمائے کی ایک معقول رقم علیحدہ رکھنی ہوگی۔ اس کام کو چلانے اور ترقی دینے میں جو صرفہ آئے گا اس کے لئے علیحدہ ایک قرضہ ٹیکس عوام سے لیا جاسکتا ہے جس کو بہ خوشی ہر شخص دینے پر آمادہ ہوگا۔ اس ٹیکس کی مقدار بہت کم ہوگی یہ بھی ممکن ہے کہ ٹیکس کی ضرورت نہ پڑے کیونکہ حکومت کے خزانوں کی مقامی شاخیں یا ڈاک خانوں کے سیونگ بینک اس کام کو انجام دے سکتے ہیں۔ جو لوگ اپنا فاضل سرمایہ بطور امانت یا چالو کھاتے (CURRENT ACCOUNT) کی شکل میں جمع کرنا چاہیں وہ انہیں شاخوں میں جمع کریں گے اور یہی فاضل سرمایہ ضرورتمند اصحاب کو قرض حسن دینے میں کام آسکتا ہے۔ کمی بیشی کی صورت میں حکومت اسکے توازن کی ذمہ دار ہوگی۔

دوسری صورت تجارتی و صنعتی قرضوں کی ہے۔ اس قسم کے کاموں کے لئے ایسے بنکوں کا قیام ضروری ہے جو بجائے سود کے منافع کی شرکت کی بنا پر روپیہ لگا سکیں۔ ایسی صورت میں بنکوں اور تاجروں میں روابط زیادہ استوار ہوں گے۔ اس قسم کے بنک حکومت کی ملک ہوں گے یا حکومت کے کنٹرول میں ہوں گے اس لئے ملکی صنعت میں حکومت کا تعلق زیادہ گہرا ہوگا۔ اگر پرائیویٹ ادارے شرکت منافع کی بنا پر روپیہ لگانا چاہیں تو ان کو اجازت ہوگی۔ لیکن ایسے ادارے حکومت کی نگرانی میں چلیں گے۔ تاکہ صنعت و تجارت پر سرمایہ داروں کا قبضہ نہ ہو سکے اور محنت اور انتظام کرنے والوں کو مناسب حصہ نفع کا ملتا رہے۔

اسی طرح اگر حکومت کسی کام کے لئے پبلک سے روپیہ چاہتی ہے مثلاً کسی ریلوے لائن کے قیام یا نہر وغیرہ نکالنے کے لئے یا کسی صنعتی اسکیم کے لئے تو اس کو بھی سودی تمسکات کے بجائے نفع کی بنا پر روپیہ وصول کرنا چاہیئے اسی طرح ہر صورت میں روپیہ دینے والے اداروں کو اس تجارت کے فروغ کا جس میں ان کا روپیہ لگا ہے زیاں سے زیادہ خیال رہے گا۔ کیونکہ اس صورت میں وہ نفع اور نقصان دونوں کے ذمہ دار ہیں۔

سود کے تباہ کن اثرات سے محفوظ رہتے ہوئے بھی بنک اسلامی طریقے پر مفید کام کر سکتے ہیں اور ضرورتمند لوگوں کے لئے قرض حسن مہیا کر سکتے ہیں۔

احتکار و اکتناز

نرخ کو بڑھتے دیکھ کر ضروریات کے سامان کو روک لینا تاکہ زیادہ نفع پر فروخت کیا جا سکے فقہی اصطلاح میں "احتکار" کہلاتا ہے اسلام اس کو ممنوع قرار دیتا ہے۔ عام حالات میں اس قانون کی قدر اتنی نہیں معلوم ہوئی جتنی کہ جنگ یا قحط یا دوسرے غیر معمولی حالات میں جبکہ سلسلۂ رسل و رسائل مسدود ہونے یا دوسرے اسباب کی بنا پر اشیاء مایحتاج کا وقت پر ملنا دشوار ہو۔ اس قسم کے قوانین کو جدید دور میں ہنگامی قوانین (ORDINANCES) کے ذریعہ نافذ کیا جاتا ہے۔ آج کل صرف غیر معمولی حالات میں غیر معمولی نفع کی خاطر مال کو روکنا . . . . (HOARDING & PROFITEERING) جرم ہے۔ لیکن اسلام کے معاشی نظام میں کسی وقت بھی اس کی گنجائش نہیں کیونکہ یہ بھی ان مذموم طریقوں میں سے ایک ہے جو دولت کو عوام سے سمیٹ کر چند ہاتھوں میں جمع کرنے کے لئے اختیار کئے

جاتے ہیں۔

اس طرح اسلام ضرورت سے زائد مال جمع کرنے (اکتناز) کو ممنوع قرار دیتا ہے سوسائٹی کے لئے اس سے مضر اقدام اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ دولت کو عوام کے ہاتھوں میں جانے سے روک کر اس کو دفن کر کے یا بنک وغیرہ میں جمع کر کے رکھا جائے۔ دولت کا مصرف یہ ہے کہ وہ عوام میں دست بدست منتقل ہوتی رہے نہ کہ ایک مقام پر رُک کر اصلی اور واقعی ضرورتمندوں کو مصیبت میں ڈال دے۔ قرآن کریم نہایت سخت الفاظ میں اس طریقے کی مذمت کرتا ہے۔ چنانچہ سورہ حشر میں اس طرح اس کی مخالفت کی ہے۔

"اور جو لوگ خزانہ بنا کر رکھتے ہیں سونے اور چاندی کو اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے سو ان کو دردناک عذاب کی خوشخبری دیدو۔ جس روز کہ اس مال پر جہنم کی آگ دہکائی جائے گی پھر اس سے داغی جائینگی ان کی پیشانیاں، پہلو اور ان کی پیٹھ (اور کہا جائے گا) یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے واسطے گاڑ رکھا تھا اور چکھو مزہ اپنے گاڑنے کا!"

اس قسم کے مال پر کم سے کم پابندی یہ عائد کی گئی ہے کہ ہر سال کے اخیر میں چالیسواں حصّہ زکوٰۃ کا اس میں سے نکال کر بیت المال میں داخل کر دیا جائے یا حاجتمندوں پر خرچ کر دیا جائے۔

قمار اور سٹّہ | اس قسم کے تمام کھیل جن میں روپیہ کی شرطیں لگائی جاتی ہیں یا وہ تجارتیں جن کا نتیجہ محض اتفاق (CHANCE)

پر مبنی ہو اسلام کے نزدیک ممنوع ہیں سٹہ بازی کا بڑا نقصان یہ ہے کہ بغیر کسی محنت اور محض اتفاقی داؤں لگ جانے سے ذرا سی دیر میں ایک آدمی دولتمند اور دوسرا آدمی مفلس ہو سکتا ہے۔ اس یک لخت مال کی تبدیلی کا سوسائٹی پر برا اثر پڑتا ہے۔ اس معاملہ میں یہاں تک احتیاط کی گئی ہے کہ پھلوں وغیرہ کی وہ فصلیں جو ابھی تیار نہیں ہوئی ہوں اور صرف پھول آئے ہوں یا پھل ابھی پوری طرح نہ نکلے ہوں اس قسم کی فصلوں کی بیع وشرا ناجائز ہے۔

زکوٰۃ اس قسم کی احتیاطی تدابیر کے باوجود بھی جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے یہ ممکن ہو کہ دولت سوسائٹی کے ایک طبقے میں دوسروں کی نسبت زیادہ جمع ہو جائے کیونکہ یہ غیر فطری ہے کہ طبقاتی امتیاز کا انسداد کلی طور سے ہو سکے۔ انسانوں کی صلاحیتوں کام کرنے کے طریقوں اور دنیاوی مواقع کے اعتبار سے افراد میں باہمی امتیاز و اختلاف لازمی ہے اور ایک کو دوسرے پر فضیلت حاصل کرنا بالکل فطری امر ہے۔ اسلامی نظام میں قانون فطرت کو روکنے اور طبقاتی امتیاز کو مٹانے کی کوشش نہیں کی گئی۔ البتہ اس کا کافی لحاظ رکھا گیا کہ دولت صرف امراء ہی میں محدود ہو کر نہ رہ جائے۔ قرآن کریم میں اس حقیقت کو اس طرح بیان کر دیا گیا:۔

ولا یکون دولۃً بین الاغنیاءِ منکم	"ایسا نہ ہو کہ دولت صرف امراء کے طبقے میں محدود ہو کر رہ جائے"۔

اس لئے یہ لازم قرار دیا گیا کہ اس تمام بڑھنے والے سرمائے پر یعنی جس میں نمو پانے کی صلاحیت ہو جو نقد یا مال کی شکل میں ایک سال تک کسی کی ملکیت میں رہا ہو اس پر ایک مناسب مقدار میں سالانہ ٹیکس (CAPITAL LEVY)

مقرر کیا جائے۔ اس ٹیکس کی مقدار ابتدائی زمانۂ اسلام میں سرمائے کا چالیسواں حصہ تھی۔ لیکن حکومت وقت کو یہ حق حاصل ہے کہ حسب ضرورت اس میں کمی بیشی کی جاسکے۔ قابل کاشت زمین پر زکوٰۃ واجب نہیں بلکہ اس کی پیداوار پر اس کی حیثیت کے لحاظ سے معین کی گئی ہے۔ آبپاشی کی زمین پر پانچواں حصہ (خمس) اور بارشوں وغیرہ کے پانی سے سینچی ہوئی زمین کی پیداوار پر دسواں حصہ (عشر) واجب ہے۔

زمین پر زکوٰۃ نہ ہونے کا سبب غالباً یہ ہے کہ زمین کسی فرد کی ملک نہیں بلکہ خدا کی ملک ہے اس لئے حکومت کو اس پر پورا تصرف حاصل ہے۔ ہوا اور پانی کی طرح زمین سے بقدر ضرورت فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ اس لئے اس فائدے پر جو پیداوار کی شکل میں ملتا ہے زکوٰۃ واجب کی گئی۔ علاوہ ازیں زمین بذات خود سرمایہ نہیں بلکہ دولت پیدا کرنے کا ذریعہ ہے اسی لئے اس میں پیداشدہ دولت کے لحاظ سے ٹیکس مقرر کرنا عین قرین انصاف ہے۔
اسی طرح مال تجارت کا معاملہ ہے۔ اکثر فقہائے کے نزدیک مال تجارت کی قیمت پر زکوٰۃ کا چالیسواں حصہ واجب ہے۔ لیکن اس میں کئی مشکلات سامنے آتی ہیں اوّل تو تجارت کے ہر مال پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوسکتی کیونکہ وہ مال جو ایک سال سے کم مدت میں فروخت ہوجائے لائق زکوٰۃ نہیں۔ کیونکہ آنحضرتؐ کے قول کے مطابق زکوٰۃ کا اصول ہی یہ ہے کہ لازکوٰۃ فی المال حتی یحول علیہ الحول۔ جو مال ایک سال تک فروخت نہ ہوسکے اس پر زکوٰۃ مقرر کرنا اصول زکوٰۃ کے خلاف معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس طرح تجارت کا اصل سرمایہ

ہر سال کم ہوتا رہے گا۔ جو تجارت کی ترقی کی راہ میں حائل ہوگا۔ برخلاف اس کے غیر مسلم جن پر زکوٰۃ واجب نہیں اپنی تجارت کو خود مسلم حکومت ہی میں مسلمانوں کے مقابلہ میں ترقی دیں گے کیونکہ کوئی سرمایہ کا ٹیکس نہ ہونے کی شکل میں ان کا سرمایہ قائم رہے گا۔ اس لئے حکومت کو اس مسئلہ میں اجتہاد کا پورا حق ہونا چاہیئے کہ جائداد کی طرح مال تجارت یا سرمایہ صنعت و حرفت پر جو خواہ مشینوں کی شکل میں ہو یا دوسرے مال کی صورت میں زکوٰۃ مقرر کرنے کی بجائے اس کی آمدنی پر عائد ہو سکے۔ اس لئے یہ انکم ٹیکس کی طرح کا محصول ہوگا جس سے سرمایہ بھی بدستور رہے گا اور اصحاب نصاب سے ٹیکس بھی وصول ہوتا رہے گا۔ اسی طرح وہ جائداد جو اپنے رہائشی مکان کے علاوہ ہو اور کرایہ پر چلتی ہو در اصل مال تجارت میں آتی ہے۔ اس کی آمدنی پر زکوٰۃ ہونی چاہیئے۔

بغیر محنت حاصل کردہ مال پر مثلاً معدنیات، خزائن یا اموالِ غنیمت پر پانچواں حصہ زکوٰۃ واجب ہے۔ زکوٰۃ کے ذریعہ وصول کردہ تمام آمدنی ملک کے مفلسوں۔ مساکین۔ مبلغین (مولفتہ القلوب) قرضداروں، غلاموں اور عاملین زکوٰۃ پر صرف کی جائے گی۔ اسی طرح امرا سے حاصل کردہ دولت حاجتمندوں پر صرف کی جائے گی۔ یہی زکوٰۃ کا مقصد ہے جو رسول کریمؐ کے ان بلیغ الفاظ میں مضمر ہے "تو خذ من اغنیا ئھم فترد الی فقرا ئھم"

فی المال حق سوا ء الزکوٰۃ

انسداد سود اور اجراء زکوٰۃ کے بعد دولت کی تقسیم خود بخود اس طرح ہو جاتی ہے کہ امراء کی دولت کا بڑا حصہ غربار کے لئے حاصل ہو جاتا ہے لیکن اگر اس کے باوجود

بھی افلاس باقی رہے اور نادار افراد سوسائٹی میں موجود ہوں تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ امراء نے اپنے فرائض پوری طرح ادا نہیں کئے۔ حکومت ہر فرد کی معمولی ضروریات کو پورا کرنے کی کفیل ہے۔ رہنے کو معمولی مکان پہننے کو اس قدر کپڑا کہ اچھی طرح ستر پوشی ہو سکے اور کھانے کو سادی غذا۔ ان ضروریات کا بہم کرنا حکومت کا اولین فرض ہے۔ اس لئے اگر ان محصولات سے یہ فرائض پورے نہیں ہو سکتے تو بلا شک حکومت کو حق حاصل ہے کہ وہ زکوٰۃ میں اضافہ کر دے۔ زمین کی پیداوار کو اجتماعی قبضہ میں لے لے یا دوسرے محصول جاری کر دے جس کا بار ان امراء پر پڑے جن کے پاس ضرورت سے زائد دولت ہے۔ قرآن کریم میں واضح طور سے امراء کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ والدین۔ ذوی القربے یتیمے۔ مساکین۔ مسافروں۔ غلاموں اور ہمسایوں کے ساتھ اچھی طرح سلوک کریں اور ان کے حقوق ان کو دیں۔ اسلئے اگر حکومت زکوٰۃ کی رقم سے ان فرائض سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتی تو اس کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ امراء سے بطور عطایا، صدقات، یا محصولات اس مقصد کے لئے اتنی رقم حاصل کر لے کہ ناداروں کی ضروریات پوری ہو سکیں اگر حکومت اپنے فرائض سے بے خبر ہے اور امراء اپنی ذمہ داری محسوس نہیں کرتے تو عوام کو اسلام یہ حق دیتا ہے کہ بہ جبر یا بغاوت کر کے حکومت اور امراء سے وہ اپنا حق چھین لیں۔ بہت واضح طور سے افراد کو اسلام یہ حق عطا کرتا ہے۔

”ولا تنس نصیبک من الدنیا“	دنیا میں اپنے حصہ کو فراموش نہ کرو۔

حکومت اسلامی کی بنیاد ہی اس اصول پر ہے کہ ہر فرد خواہ وہ کسی قوم، رنگ و نسل سے تعلق رکھتا ہو اپنی ضروریات حاصل کرنے کا پورا حق رکھتا ہے۔

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا	اور زمین پر چلنے والے ہر جاندار کی رزق کی ذمہ داری اللہ نے اپنے اوپر لے لی ہے۔

ایسی صورت میں اگر حدود مملکت کے کسی حصّے میں بھی کوئی ننگا یا بھوکا فرد موجود ہو تو حکومت کا فرض ہے کہ بیت المال سے اس کی ضرورت پوری کرے اور اس مقصد کے حصول کے لئے ان لوگوں سے محصول وصول کرے جو ضرورت سے زائد مال کے مالک ہیں۔ ایام جنگ یا قحط میں اس قسم کے اقدامات اکثر ضروری ہو جاتے ہیں۔

زمینداری سسٹم

اسلام انفرادی ملکیت کو نہ صرف جائز تسلیم کرتا ہے بلکہ اس کی نمو اور افزائش کے لئے تمام ذرائع بہم پہنچانے کی ہدایت کرتا ہے۔ اس کے ساتھ انفرادی مال پر اجتماعی مفاد کی خاطر مناسب حدود و قیود بھی عائد کرتا ہے۔ زمین کی ملکیت کی معاملے میں کتب احادیث میں مختلف روایات ملتی ہیں اسی لئے زمین کو بٹائی پر یا لگان پر کاشتکار کو کاشت کے لئے دینے میں علماء قدیم میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ لیکن یہ امر مسلّمہ ہے۔ کہ اسلامی نظام کی تکمیل کے بعد بالخصوص خلفاء راشدین کے دور میں حکومت اور کاشتکاروں کے درمیان جاگیرداروں یا زمینداروں کی کوئی جماعت ایسی موجود نہ تھی جو زمینوں کے قطعات و مربع جات کی مالک ہوتی اور کاشتکاروں سے لگان یا بٹائی وصول کرکے معمولی مقدار حکومت کو مالگذاری کے طور سے دیتی

اور باقی اپنی عیش و عشرت پر صرف کرتی۔ یہ نظام ہر ملک میں شہنشاہیت اور ملوکیت کے عہد میں رائج رہا چنانچہ اسلام سے قبل بھی ایران و روم وغیرہ ممالک میں زمینداروں و جاگیرداروں کے نام سے ملوکیت کے نمائندے موجود تھے جن پر حکومت کے بقاء و استحکام کی ذمہ داریاں ہوتی تھیں اور یہ لوگ غریب مزدوروں اور کاشتکاروں کی گاڑھی کمائی سے نہ صرف اپنا پیٹ بھرتے تھے بلکہ بادشاہوں اور وزیروں کی عیاشیوں کے لئے خزائن جمع کرتے تھے۔ اسلام نے اس قسم کے تمام نظامہائے فرسودہ کو یک لخت ختم کیا۔ اور جن ممالک پر مسلمانوں نے قبضہ کیا ان کی مفتوحہ زمینوں کو جاگیرداری یا عطیات کے طور سے مسلمانوں میں تقسیم نہیں کیا بلکہ پرانے کاشتکاروں کے پاس رہنے دیا۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں جب عراق، شام اور مصر فتح ہوئے تو یہ مسئلہ سامنے آیا کہ آیا زمین اور اموال غنیمت کی طرح مجاہدین میں تقسیم کی جائے یا اس پر اجتماعی تصرف رکھا جائے۔ تمام اصحاب کرام کے مشورہ کے بعد یہی طے ہوا کہ زمینوں کو قومی بیت المال کے تصرف میں رہنا چاہیئے۔ اور کاشتکاروں سے براہ راست حکومت پیداوار کا مقررہ حصہ بطور زکوٰۃ یا خراج وصول کرے۔ یہ فیصلہ اسلامی معاشیات کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے بعد خلافت راشدہ میں برابر اسی اصول پر عملدرآمد ہوتا رہا۔ لیکن جب اسلام میں ملوکیت نے راہ پائی تو اور قوموں کی طرح جاگیرداری کا طریقہ یہاں بھی رائج ہو گیا۔ حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے اپنے دور میں اس طریقہ کا خاتمہ کیا اور تمام جاگیروں کو مرکزی بیت المال کے تصرف میں دے دیا۔ اسی اور اس قسم کی دوسری

اصطلاحات کی بنار پر آپ کو اپنے ہی خاندان کے افراد کے ہاتھوں زہر کا شکار ہونا پڑا۔

بہرحال زمینداری اور جاگیرداری کا موجودہ نظام مصر و روم و ایران کی کی قدیم شہنشاہیت کی یادگار ہے اسلام کے نزدیک زمین خدا کی ملک ہے۔ اس لئے قوم یا حکومت کو ہی اس پر کلی اختیار حاصل ہے۔ البتہ جو شخص اپنی ذاتی محنت سے کاشت کر کے فصل پیدا کرتا ہے وہ اس زمین کا نہیں بلکہ اس پیداوار کا مالک ہے جو اس کی محنت کا نتیجہ ہے۔ حکومت اس سے مقررہ مقدار بطور محصول وصول کر سکتی ہے۔ لیس الانسان الا ما سعیٰ کے زریں اصول پر اسلامی نظام کی بنیاد ہے۔

قانونِ وراثت

اسلامی معاشیات میں قانونِ وراثت کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ کوئی شخص خواہ کتنی ہی دولت کیوں نہ جمع کر لے وہ صرف اپنی زندگی میں اس کو اپنے قبضے میں رکھ سکتا ہے اس کے بعد اس کا متوفی کے ورثار میں تقسیم ہونا لازمی ہے۔ سرمایہ دار اقوام میں جہاں دولت چند افراد میں محدود رکھنے کا اصول کار فرما رہتا ہے بالعموم متوفی کا بڑا لڑکا یا متبنٰی پوری دولت کا وارث بن جاتا ہے اور دوسرے بھائی اور دیگر رشتہ دار محروم رہتے ہیں۔ اس کا مقصد یہی ہے کہ مال و دولت ایک خاندان میں محفوظ رہے۔ دولت کی تقسیم کے اس زریں اصول سے جو اسلام نے قانونِ وراثت کی شکل میں نافذ کیا۔ دوسری اقوام اب تک ناآشنا رہی ہیں۔ مغربی ممالک، ہندوستان اور ایشیا کے اکثر ممالک میں اب تک عورتوں کو وراثت میں

کوئی حصّہ نہیں ملتا۔ لیکن اسلامی قانونِ وراثت کی رو سے نہ صرف بیوی، خاوند، بھائی، والدین اور دوسرے قریبی رشتہ دار مستفید ہوتے ہیں بلکہ بعض اوقات دور کے اقارب بھی وراثت کے مستحق ہوتے ہیں۔ اسلام نے اس معاملہ میں اس حدتک سختی سے کام لیا ہے کہ کسی فرد کو یہ حق بھی نہیں دیا کہ وہ اپنی زندگی میں اپنی پوری دولت کی وصیّت کسی ایک فرد کے لئے کردے۔ اس کو صرف اپنی مجموعی دولت کا ایک تہائی بہ طور وصیّت اپنے بعد دلانے کا حق ہے باقی دولت لازمی طور سے بقیہ ورثاء میں تقسیم ہوگی۔

یہ ہے اسلامی نظام معاشیات کا ایک مختصر خاکہ جس پہ ایک سرسری نظر ڈالنے سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ اسلام میں دولت سوسائٹی کے کسی ایک مخصوص طبقے میں محدود نہیں رہ سکتی۔

حدودِ شرعی اور معاشی نظام کا باہمی ارتباط

اسلام کے تعزیری قوانین اسکے سیاسی اور معاشی نظام سے وابستہ ہیں۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے اسلام ایک منظم مشین اور متحرک جسم کی مانند ایک نظام Organism ہے جس طرح مشین کا کوئی پرزہ اس سے علیحدہ ہوکر متحرک نہیں ہوسکتا اور جسم کا کوئی عضو مرکزِ جسم سے علیحدہ ہوکر اپنا فعل انجام نہیں دے سکتا بالکل اسیطرح نظام سے علیحدہ ہوکر اسلام کا کوئی قانون صحیح طور سے نافذ نہیں ہوسکتا۔ اسلام نے جہاں افراد کیلئے شخصی آزادی کی نعمت اور ان کیلئے دولت کی تقسیم کا ایک خاص نظام تجویز کیا ہے تاکہ عوام خوشحالی اور امن کے ساتھ زندگی گذار سکیں۔ وہیں بہت سخت تعزیری قوانین مقرر کئے ہیں۔ اسلامی قانون کی رو سے چوری کے جرم میں ہاتھ کاٹنے اور زنا کے جرم میں سنگساری کی سزا مقرر ہے۔ جو بہ ظاہر بہت سخت ہے۔ سوال یہ ہے کہ عہد حاضر میں جبکہ موت کی سزا کو کلی طور سے بند کیا جارہا ہے۔ ہاتھ کاٹنے اور سنگساری کی

عقوبتوں کا نفاذ ممکن ہے ؟ کیا اس قسم کے قوانین کو ظلم اور سفاکیت سے تعبیر نہیں کیا جائے گا ؟ لیکن اگر اسلام کے مکمل نظام پر ہم ایک طائرانہ نظر ڈالیں تو بہت جلد یہ حقیقت واضح ہو جائیگی کہ اسلامی سوسائٹی میں ان قوانین کا نفاذ نہ صرف ممکن بلکہ بہت ضروری ہے۔

اسلامی قوانین پر تنقید کرتے وقت جو غلط فہمی اس قسم کے اعتراضات کی محرک ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ناقدین بالعموم سوسائٹی کا وہی غیر فطری تصور اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ جس میں وہ محصور ہیں پھر اس سوسائٹی کا جوڑ قوانین اسلامی سے لگا کر وہ یہ خیال کر بیٹھتے ہیں کہ اسلام اسی قسم کے حالات و ماحول میں ان حدود شرعی کو نافذ کرنا چاہتا ہے جو حقیقت میں ایک خاص نظام سے وابستہ ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ اسلام ان قوانین کو نافذ کرنے سے پہلے ایک خاص قسم کی سوسائٹی کی ترتیب و تشکیل کا سبق دیتا ہے اسلامی سوسائٹی کی بنیاد اتقار اور احتساب نفس کے ساتھ ساتھ ایک خاص نظام پر ہے جس کے کلی طور سے نافذ ہونے پر ان قوانین زیر بحث کا اطلاق ہو سکتا ہے اسلام کا ایک معمولی قانون بھی نافذ نہیں ہو سکتا جب تک اس کا ایک مکمل ضابطہ حیات اور دستور العمل نافذ نہ ہو جائے مثلاً قانون شہادت ہی کو لیجئے جب تک سوسائٹی کے افراد کے دلوں پر راست بازی۔ حق گوئی اور سچی " قسم " کی اہمیت کا نقش مسکوک نہیں ہوگا اس وقت تک " شاہد " یا مدعا علیہ کا قسم کھانا جس پر اس قانون کی بنیاد ہے بیکار ہوگا۔ اسی طرح اس ماحول میں جس میں بے پردگی اور مخلوط سوسائٹی عام ہو۔ سنیما و شراب نوشی کا کثرت سے رواج ہو۔ نکاح و طلاق کے قوانین غیر فطری ہوں۔ دولت و سرمایہ کا نظام غلط ہو۔ تعلیم و تربیت کا صحیح انتظام نہ ہو۔ زنا و چوری اور دوسرے جرائم کے تمام محرکات وہاں موجود ہوں۔ قطع ید۔ رجم اور کوڑوں کی سزا کے احکامات کا نفاذ واقعی ظلم ہوگا۔ اس لئے اسلام نے نظام معیشت اور تعزیر

"قطع ید" میں اور نظام معاشرت و تمدن میں اور قانون "رجم" میں خاص ربط قائم رکھا ہے۔ اسلام سب سے پہلے ان تمام اسباب و محرکات کو یکسر ختم کرنا چاہتا ہے جن سے جرائم کی تخلیق ہوتی ہے۔ مثلاً چوری عام طور سے افلاس و ناداری اور بھوک اور فاقہ کشی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے ان تمام اسباب کو ختم کرنے کے لئے اسلام نے معیشت کی بنیاد تقسیم سرمایہ پر رکھی جس سے نہ ایک طبقہ برابر امیر ہوتا چلا جائے اور نہ دوسرا غریب اس نے سود کا لین دین بند کر دیا تاکہ مہاجنی نظام سوسائٹی کے ایک حصّہ کو دوسرے طبقے کا خون چوسنے پر آمادہ نہ کرے۔ غیر ضروری رسومات پر پابندیاں عاید کر دی گئیں تاکہ ان کی ادائیگی میں فضول خرچی سے مجبور ہو کر قرض کی نوبت ہی نہ آئے ضروری قرضے کے لئے بیت المال سے "قرضِ حسن" کا طریقہ جاری کر دیا پھر سرمائے پر سالانہ ۲/۱ ۲ حصہ بطور زکواۃ مقرر کر دیا تاکہ سرمایہ بند پانی کی طرح ایک جگہ ٹھہرنے نہ پائے پھر قانون وراثت اس طرح جاری کیا جس سے سرمایہ دار کے مرنے کے بعد اس کا اندوختہ سرمایہ اس کے ورثا میں تقسیم ہوتا رہے۔ اس طرح یہ بالکل ناممکن ہو گیا کہ سرمایہ کسی ایک گروہ کے پاس رہ سکے اور دوسرا گروہ نادار ہوتا چلا جائے۔ پھر تجارت کا ایک خاص معیار مقرر کر دیا جس میں گراں نرخ پر فروخت کرنے کی امید میں غلّہ جمع کرنے تک کی اجازت نہیں دی گئی۔ ایسی بیع کو ناجائز قرار دیا جس میں خریدار کو کسی طرح ظاہر یا خفیہ طور سے دھوکہ دیا جا سکے اس قسم کی تجارتوں کو جن کا انحصار شرط پر ہو مثلاً سٹہ۔ جوا۔ پارس وغیرہ کو ممنوع قرار دیا گیا۔ اور بیمار و اپاہج نادار و یتیم کی تمام ضرورتوں کو زکواۃ کے نظام بیت المال سے پورا کر دیا۔ بچوں کی تعلیم و پرورش۔ ناداروں کی اولاد کی شادیوں اور اسی قسم کے اخراجات کو بیت المال سے پورا کرنے کی ہدایت کی گئی۔ ان قوانین کے نفاذ کے بعد ایک معمولی انسان کو کسی چیز کی ضرورت

باقی رہتی ہے ؟۔ اشتراکیت جن مسائل کے حل کرنے میں اب تک ناکام رہی ہے اسلام کے اس نظام نے قرن اوّل کے مسلمانوں میں ان سب کا حل بخوبی پیش کر دیا تھا۔ عمر بن عبدالعزیز کے زمانے میں تلاش کرنے سے بھی کسی نادار کا پتہ نہ چلتا تھا۔ جس سوسائٹی کے افراد کی تمام زندگی کی کفیل اسٹیٹ ہو اور فرد پر صرف اس کی حیثیت کے مطابق کسب و عمل کی ذمہ داری عائد کی گئی ہو اس سوسائٹی کے اندر چوری کا ہونا ایک غیر معمولی واقعہ ہوگا۔ ان تمام آسانیوں کے باوجود بھی اگر کوئی چوری کرتا ہے تو یہ اس کی خبیث و حریص عادت وخصلت اور طمع و خود غرضی کا نتیجہ ہے اس کے لئے غیر معمولی سزا کی ضرورت ہے بلکہ اس کا وجود ہی اس قسم کی سوسائٹی پر ایک بار گراں ہے۔ ایسے افراد کے لئے یقیناً عبرت آموز سزا ملنی چاہیئے۔

پھر بھی اس قدر رعائتیں دی گئی ہیں کہ غیر عاقل و نابالغ کو یہ سزا نہیں دی جاسکتی۔ اگر کسی چوری میں کئی آدمی شریک ہوں تو سوائے امام مالک کے اور سب ائمہ کے نزدیک کسی کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ ایک مقررہ نصاب سرقہ سے کم کی چوری پر بھی یہ سزا نہیں دی جاسکتی۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک گھاس۔ لکڑی، بانس، مچھلی، پرندے شکار، مٹی، چونا، کھانے پینے کی چیزیں۔ روٹی، دودھ، گوشت، تر میوہ، درختوں پر لگے ہوئے پھل اور اشربہ وغیرہ پر قطع ید کی سزا نہیں ہے۔

اس طرح اسلام نے ایک طرف چوری کے تمام اسباب کو مٹا دیا اور دوسری طرف سزا کی شرائط کو بے حد مشکل کر دیا۔ اس کے باوجود بھی اگر جرم ثابت ہوتا ہے تو اس کے لئے اسی تناسب سے سخت سزا مقرر کی گئی۔

اس لئے ایسی سوسائٹی میں جہاں ایک طبقہ اتنا غریب ہو کہ بعض اوقات فاقہ کشی کی نوبت عوام کی اچھی خاصی تعداد کو آتی ہو جس میں افراد کی زندگیوں کا کوئی بار حکومت کے

ذمہ نہ ہو۔ محصولوں اور ٹیکسوں کی اس قدر بھرمار کہ درمیانی طبقہ کے لوگ بھی پریشان ہو جائیں۔ جہاں جوا تجارت کے پردے میں جاری ہو جس سوسائٹی میں مزدور سرمایہ پرستی کا اس قدر غلام ہو کہ اس کا ہر لمحہ سرمایہ دار کی ملک بن چکا ہو اور جس کے مصائب سے تنگ آکر اس نظام کی تباہی کی وہ اس طرح خدا سے دعائیں مانگتا ہو۔

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں ہیں تلخ بہت بندہ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ؟ دنیا ہے تری منتظر روز مکافات

(اقبال رح)

جہاں کے نظام تمدن کا ادنیٰ کرشمہ "مرد بیکار و زن تہی آغوش" کی شکل میں نمودار ہو۔ وہاں اسلام کا قانون قطع ید نافذ کرنا واقعی صریحاً ظلم ہوگا۔ جس زمانہ اور جس وقت میں اسلام کا مکمل نظام قائم نہ رہے اسوقت صرف قوانین اسلام کا جاری کر دینا مفید نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ خلافت راشدہ میں جنگ کے زمانے میں حدود شرعی کو ملتوی کر دیا جاتا تھا اور اسی لئے حضرت عمرؓ نے قحط کے زمانے میں قطع ید کی سزا موقوف کر دی تھی۔

اسی طرح رجم اور کوڑوں کی سزا کے متعلق قیاس کیا جاسکتا ہے اسلام اس سزا کو ایسی سوسائٹی میں نافذ نہیں کر سکتا جہاں بے شرمی و بے حیائی عام ہو حسن چاندی کے سکوں کی طرح گردش کرتا ہو۔ جہاں عورت مرد کا آلۂ کار اور مرد اپنی خواہشات کا غلام ہو۔ جہاں منشیات و خمریات کا دور دورہ ہو اور فواحشات و منکرات کی گرم بازاری ہو۔ قدم قدم پہ ایمان شکن اور حیا سوز دلفریبیاں دعوت نظارہ دیتی ہوں اور جہاں کے افراد۔ "صید خود صیاد را گوید بگیر" پر عمل پیرا ہوں۔ جہاں ایک سے زیادہ شادی کی اجازت نہ ہو مگر عورتیں اور مرد آپس میں بہیمانہ طور سے ارتباط و اختلاط کر سکیں۔ جہاں نکاح و خلع کے

قوانین بے حد سخت ہوں جن کا لازمی نتیجہ انسان کو گناہ پر آمادہ کرنا ہو - اور جہاں سرمایہ داری کے غلط نظام کی وجہ سے فراوانی دولت خود ایک طبقے کی عیاشیوں کی محرک ہو - اسلام اس قانونِ سزا کو اپنی پوری رحمتوں کے ساتھ نافذ کرنا چاہتا ہے - وہ سب سے پہلے نظامِ معیشت میں انقلاب کرنا چاہتا ہے - کیونکہ سرمایہ داری ہی تمام فتنوں اور جرائم کی جڑ ہے یہ سرمایہ پرستی ہی کا غلط نظام ہے جو ایک طبقے کو دوسرے طبقے کے استعمال (Exploitation) پر مجبور کرتا ہے اور سرمایہ دار طبقے سے اس قسم کے جرائم کراتا ہے اس لئے نظامِ معیشت کو اسلام تقسیم سرمایہ کے ان اصولوں کی بنا پر حل کرتا ہے جو ابھی شمار کرائے گئے ہیں - اس کے بعد ان تمام محرکات کا انسداد کرتا ہے جو زنا کے ارتکاب کا باعث ہیں - وہ مرد و عورت کے اختلاط پر مناسب پابندیاں عائد کرتا ہے - منشیات و خمریات کی کوئی گنجائش نظامِ اسلام میں نہیں ہے - سینما و تھیٹروں کی بے حیائی و بے شرمی کو اس سوسائٹی میں کوئی دخل نہیں ہو سکتا خانگی زندگی کو نکاح و خلع کے قوانین فطری سے رحمت کا ملہ بنا دیا گیا - ایک شخص کو چار شادیوں کی اجازت دیدی گئی - چار شادیوں کے باوجود بھی مہر کی ادائیگی کے بعد طلاق سے منع نہیں کیا گیا ایسی صورت میں جبکہ تمام صنفی خواہشات کی تکمیل کے جائز وسائل و ذرائع مہیا کر دیئے گئے ہوں زنا کے ارتکاب کی کونسی گنجائش باقی رہتی ہے ؟ اس کے باوجود بھی اگر کوئی اس فعل قبیح کا ارتکاب کرتا ہے تو واقعی ایسی سوسائٹی میں شیطانوں کی ضرورت نہیں ہے - ان کی زندگی کا ختم کر دینا ہی بہتر ہے -

اس نظام کے قیام کے ساتھ ہی اسلام سوسائٹی کے افراد کے ساتھ اس دنیا ہی میں تعلق قائم نہیں رکھتا بلکہ اس کی بنیاد ہی حیات بعد الممات کے تخیل پر قائم ہے مسلمانوں کے تمام امور و مہمات دنیوی حیات اخروی سے وابستہ اور نجات دارین کے حصول کا ذریعہ ہیں اس لئے

ان جرائم کی سزاؤں کا ایک مقصد انسان کو اس کے گزشتہ گناہوں سے پاک کرنا ہے لہذا احادیث نبوی سے ثابت ہے کہ حد شرعی کے بعد انسان کی تمام گذشتہ معصیتیں دُھل جاتی ہیں اور وہ ایسا ہو جاتا ہے جیسا کہ اسی وقت ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے یہ اسی اسلامی تربیت و نجات اخروی کا جذبہ تھا کہ لوگ خود آکر اپنے جرائم کا اظہار کر دیتے اور رجم کی سزا کو بخوشی قبول کر لیتے تھے اس زمانہ میں نہ حوالات تھی نہ جیل و پولیس کا وہ نظام تھا جو آج ہے لیکن اس کے باوجود بھی مجرم خود آکر اپنے آپ کو پیش کر دیتے اور سزاؤں کو بخوشی برداشت کر لیتے تھے یہی وجہ تھی کہ آج جبکہ پوری کوشش اور نئی تحقیقات علمیہ کے تمام وسائل کو کام میں لانے کے باوجود مغربی ممالک کے بڑے سے بڑے متمدن شہر میں بھی جرائم کے ارتکاب میں کوئی کمی واقع ہونے کے بجائے زیادتی ہو رہی ہے اس قرن اول میں چوری کا نام و نشان تک نہ رہا تھا۔ ایک بڑھیا عورت سینکڑوں میل کا سفر کر کے آتی اور کوئی ٹوکنے والا نہ تھا۔ زنا اور دوسرے جرائم کا بالکل انسداد ہو گیا تھا یہ ایک معجزہ ہے جو آج دنیا کے مورخین کے لئے موجب حیرت بنا ہوا ہے۔ یہ سب کچھ نظام اسلامی کے قیام کا نتیجہ تھا۔ آج بعض آزاد و نیم آزاد اسلامی ممالک میں حدود شرعی کے جاری ہونے کے باوجود بھی جرائم کا انسداد کلی طور سے نہیں ہوتا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کے قوانین تعزیر کو اس کے اصل نظام سے علیحدہ کر کے نافذ کر دیا گیا ہے جو جسم کے کٹے ہوئے اجزاء اور مشین سے جدا کئے ہوئے پرزوں کی طرح بیکار اور مردہ ہے۔

مخلوط حکومت کا نظریہ اور اسلام

یہ ان چند اصولوں کا مختصر خاکہ ہے جن پر اسلامی حکومت کی بنیاد ہے جو اسٹیٹ ان اصولوں پر قائم نہ ہو اس کو ہرگز اسلامی حکومت نہیں کہا جا سکتا خواہ اس کے حدود میں رہنے والے اور ان کے حکام و امراء نسلی حیثیت سے مسلمان ہی کیوں نہ ہوں۔ آجکل مسلم ممالک میں جو

حکومتیں وطنیت یا نسلیت کی بنا پر قائم ہیں اور جن کی بنیاد ملوکیت یا جمہوریت یا فسطائیت پر ہے ان کو اسلامی اسٹیٹ کے نام سے موسوم کرنا اصولی غلطی ہے اسلامی اسٹیٹ کو قائم کرنے اور چلانے میں صرف وہی لوگ حصہ لے سکتے ہیں جو اسلام کے سیاسی۔ اقتصادی اور عمرانی پروگرام کے ہر اصول سے متفق ہوں چونکہ اسلامی نظام میں داخل ہونے کا راستہ ہر قوم اور ہر فرد کے لئے یکساں طور سے کھلا ہے اس لئے اس نظام حکومت میں اس کی کوئی شرط نہیں ہوگی کہ صرف وہی لوگ اس کے ارکان ہوں جو حدود مملکت میں رہتے ہوں خواہ ان کا سیاسی پروگرام حکومت سے مختلف ہی کیوں نہ ہو۔ اور اس کے باہر رہنے والے افراد باوجود سیاسی ہم آہنگی کے اجنبی سمجھے جائیں جس مذہب کی تعلیم الخلق عیال الله پر ہو اور جس کے نزدیک بنی نوع انسان ایک امت ہوں اس کی رو سے یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی فرد اس کے تجویز کردہ پروگرام کو ماننے کے بعد صرف بیگانگیٔ وطن کی بنا پر حکومت میں حصہ دار نہ ہو سکے لہٰذا ہر وہ شخص جو اسلامی حکومت کے پروگرام پر حلف وفاداری اٹھائے اور خود کو اس نظام اور اس حکومت کا تابع اور شہری بنا لے اس میں برابر کا شریک ہے۔ اس طرح اگر کوئی فرد اسلامی حکومت کے اصول اور پروگرام کو نہیں مانتا اور خود اپنا کوئی دوسرا سیاسی نظریہ رکھتا ہے جس کا اس کو اسلامی اسٹیٹ میں رہتے ہوئے بھی پورا حق ہے تو وہ اس اسٹیٹ کے نظام کو چلانے میں حصہ نہیں لے سکتا خواہ وہ اس حدود حکومت میں ہی کیوں نہ رہتا ہو اور خواہ وہ نسلی حیثیت سے مسلمان ہی کیوں نہ ہو۔ اس طرح حکومت اسلامی کا نظریہ ان حکومتوں کے نظریات سے بالکل مختلف ہے جن کی اساس قومیت یا وطنیت پر قائم ہے۔ ان حکومتوں کی بنیاد اس اصول پر ہو کہ ان کے حدود میں رہنے والے تمام افراد ایک قوم ہیں خواہ ان کے سیاسی و اقتصادی نظریات کچھ بھی ہوں چنانچہ انگلستان میں رہنے والے تمام افراد ایک قوم ہیں خواہ ان کے سیاسی و

اقتصادی نظریات کچھ ہی ہوں چنانچہ انگلستان میں رہنے والے افراد خواہ وہ کمیونسٹ ہوں یا لبرل یا قدامت پرست سب ایک قوم کے افراد سمجھے جاتے ہیں اس لئے مختلف سیاسی پارٹیوں کے مخلوط وزارت ان ممالک میں ایک مستقل موضوع بن گیا ہے۔ اسلام میں کسی مخلوط حکومت کی گنجائش نہیں۔ اسلام نے افراد کو جہاں ہر معاملے میں آزادی دی ہے اور اپنے اصولوں میں بے حد لچک رکھی ہے وہیں اپنے سیاسی بنیادی اصولوں میں کسی سمجھوتے کی گنجائش نہیں چھوڑی۔ اسلامی نظام قائم ہی نہیں رہ سکتا اگر اس کا اختلاط غیر اسلامی پروگرام سے قائم کر دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ عرب کے غیر مسلم اپنے تمدن۔ لباس اور زبان کی یکسانیت کے باوجود اسلامی حکومت کے ساتھ ملکر مخلوط حکومت نہیں بنا سکے۔ مخلوط حکومت کا نظریہ جدید ممالک میں بھی ناکام ہوتا نظر آرہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سیاسی پروگرام کی یک جہتی اور افراد کی ہم آہنگی کی غیر موجودگی میں جو اختلاط قائم ہوگا وہ فرضی اور غیر فطری ہوگا۔ انگلستان کے باشندے ایک قوم کے افراد ہونے کے باوجود سوائے ہنگامی اور غیر معمولی حالات کے کسی مشترک پروگرام پر متحد نہ ہونے کی وجہ سے مخلوط وزارت نہیں بنا سکتے۔ خود ہندوستان میں مخلوط حکومت کی تشکیل میں جو دقتیں رونما ہوئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ مخلوط حکومت کا نظریہ کس قدر غلط ہے۔ ہندوستان میں مطالبہ پاکستان کی اساس اسی نظریے پر قائم تھی اور دراصل یہ مطالبہ اس بات کا زبردست ثبوت ہے کہ اس ملک میں بسنے والی مختلف اقوام باہمی طور سے کسی ایک سیاسی پروگرام پر متحد نہیں ہیں۔ اگر عارضی طور سے اس ملک میں مخلوط حکومتیں صوبوں یا مرکز میں قائم ہو بھی جائیں تو ان کی عمر بہت کم ہوگی عجب نہیں اس غیر فطری بچے کی موت پیدائش کے ساتھ ہی عمل میں آجائے۔ اور اگر کچھ دیر قائم بھی رہی تو اس سے باہمی تلخیوں میں اضافہ ہونے کے سوا اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔ مسلمانوں میں اسلامی تعلیمات اور اسلام کے سیاسی نظریات جس قدر اشاعت حاصل کرتے جائیں گے وہ

اس قسم کی مخلوط حکومتوں سے دور ہوتے جائیں گے۔ آزادیٔ وطن کے حصول کی غرض سے بیرونی اقوام کے خلاف متحدہ محاذ قائم کرنے کی جدوجہد ایک عارضی اشتراک کا سبب تو بن سکتی ہے لیکن کسی مستقل اتحاد کی اساس نہیں بن سکتی جس اسٹیٹ کی بنا کسی خاص نظریے (Ideology) پر قائم ہو وہ اسی وقت تک قائم رہ سکتی ہے جب تک اس کا ہر رکن خود اس نظریے پر عامل ہو البتہ جہاں صرف نسلی بقایا قومی ارتقا مقصود ہو اور اصولی تحریک کا کوئی سوال نہ ہو۔ وہاں اس قسم کی مخلوط حکومتیں کامیاب ہو سکتی ہیں۔ اسپین میں جہاں مذہب قوم اور نسل کی کوئی خاص تفریق نہیں ہے ۱۹۳۷ء کی خانہ جنگی سے آج تک محض سیاسی اور اقتصادی پروگرام کے اختلاف کی بنا پر کوئی اتحاد قائم نہیں ہو سکا اسی طرح روس میں جب تک حکومت خالص کمیونزم کے اصولوں پر قائم ہے یہ ممکن نہیں کہ کسی غیر کمیونسٹ جماعت کو حکومت میں شامل کیا جا سکے البتہ یہ اسوقت ممکن ہے جب کمیونزم، امپیریلزم یا نیشنلزم سے سمجھوتہ کرنے پر تیار ہو جائے۔ اسلام میں اس قسم کے سمجھوتے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اسلام کے نزدیک صحیح حکومت وہی ہوگی جو اس کے اصولوں پر قائم ہو اور جس کے چلانے والے اسلام کے پروگرام پر عامل ہوں۔

غیر مسلموں کے حقوق اسلامی اسٹیٹ میں افراد کی عام مدنی اور شہری حقوق بالکل یکساں ہیں۔ اسلامی پروگرام کو ماننے یا نہ ماننے کی بنا پر اسٹیٹ میں کسی فرد کو دوسرے فرد پر ترجیح نہیں ہے۔ حکومت ہر فرد کی آزادی کی کفیل ہے۔ اسلامی قانون کے رو سے اگر دس مسلمان ایک غیر مسلم کو قتل کر ڈالیں تو سب کے سب واجب القتل ہیں۔ ایک غیر مسلم کو نہ صرف مسلم عوام کے مقابلہ میں بلکہ خلیفہ کے مقابلہ میں بھی تمام وہی شہری حقوق حاصل ہیں جو ایک مسلمان کو ہیں مسلم اسٹیٹ میں غیر مسلموں کو اپنے مذہب اور سیاسی پروگرام کی تبلیغ و اشاعت کی پوری آزادی ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ مذہبی رواداری

اور مساوات مسلم حکمرانوں کا خاص امتیاز رہا ہے مسلم سیاست کی تاریخ کے اس عہد میں بھی جبکہ اسلامی نظام کی جگہ ملوکیت نے لے لی تھی غیر مسلموں کو مسلمانوں سے زیادہ مذہبی انسانی اور تمدنی آزادی نصیب ہوئی۔ مزدکیت۔ عیسائیت اور یہودیت وغیرہ جیسی مذہبی تحریکوں کو دنیا میں سوائے مسلم حکومتوں کے کہیں پناہ نہ مل سکی۔ جنگ کے زمانے میں بھی غیر مسلموں کی حفاظت کے لئے اسلامی حکومت کی طرف سے خاص ہدایات جاری کی جاتی تھیں مفتوحہ ممالک میں غیر مسلموں کے ساتھ جو طرز عمل روا رکھا گیا اس کی مثال دنیا کی کسی قوم کی تاریخ میں نہیں مل سکتی

سنہ ۹ھ میں جو عہد نامہ مسلمانوں اور نجران کے عیسائیوں میں ہوا۔ اس کے متعلق خود ایک عیسائی مورخ لکھتا ہے۔

"پیغمبر نے بشپوں، پادریوں، اور راہبوں کو یہ تحریر دی کہ ان کے گرجاؤں عبادتگاہوں اور خانقاہوں میں ایک چھوٹی بڑی چیز جیسی تھی ویسی ہی برقرار رہے خدا کے رسول نے یہ عہد کیا کہ کوئی بشپ اپنے عہدے سے اور نہ کوئی راہب اپنی خانقاہ سے اور نہ کوئی پادری اپنے منصب سے خارج کیا جائے اور نہ ان کے اختیارات حقوق اور معمول میں کسی قسم کا تغیر ہونے پائے اور جب تک وہ امن و صلح اور سچائی کے ساتھ رہیں نہ ان پر جبر و تعدی کی جائے اور نہ وہ کسی پر جبر و تعدی کریں"[1]

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانے میں ایک مرتبہ قبیلہ بکر بن وائل کے ایک شخص نے حیرۃ کے ایک عیسائی کو مار ڈالا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے لکھ بھیجا کہ قاتل کو مقتول کے وارثوں کے حوالے کر دیا جائے چنانچہ وہ شخص اس کے وارثوں کو دیدیا گیا اور انہوں نے اس کو قتل کر ڈالا[2]

---

[1] لائف آف محمدؐ مصنفہ میور صفحہ ۱۵۸ [2] سیرت عمر بن عبدالعزیز صفحہ ۱۵۵

آپ نے ذمیوں کی آزادی کا اس قدر خیال رکھا کہ ایک بار ربیعہ شودمی نے ایک نبطی کا گھوڑا بیگار میں پکڑ لیا اور اس پر سواری کی تو آپ نے اس کے چالیس کوڑے لگوائے ۔[۱]

آپ نے خلیفہ ہونے کے بعد اس معاملہ میں اس حد تک شدت سے کام لیا کہ ولید نے دمشق میں ایک گرجا کو توڑ کر جامع مسجد میں شامل کر لیا تھا اس کے متعلق آپ نے عامل دمشق کو لکھا کہ اس حصے کو گرا کر عیسائیوں کو اجازت دیدی جائے کہ وہ اپنے گرجا کو بنالیں ۔[۲]

حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایک شخص نے دجلہ کے کنارے گھوڑوں کے پالنے کے لئے ایک رمنہ بنانا چاہا آپ نے ابو موسیٰ اشعری کو جو بصرہ کے گورنر تھے لکھ بھیجا کہ اگر وہ زمین ذمیوں کی نہ ہو اور اس میں ذمیوں کی نہروں اور کنوں سے پانی نہ آتا ہو تو سائل کو دیدی جائے ۔

حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں جب حضرت خالدؓ نے حیرہ پر فتح حاصل کی تو یہ معاہدہ لکھ دیا :۔

"ان کے گرجے برباد نہ کئے جائیں گے ، نہ ان کو سنکھ بجانے سے منع کیا جائے گا ۔ نہ عید کے دن صلیب نکالنے سے رد کا جائے گا ۔"[۳]

دوسری قوم کے افراد کی آزادی اور مساوات کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر خود ان کے زمانہ خلافت میں جب ایک یہودی نے ایک زرہ کا دعویٰ کیا تو آپ بغیر کسی تامل کے عدالت میں معمولی فریق کی حیثیت سے حاضر ہوئے ۔ اسی طرح حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانے میں جب ایک عیسائی نے ہشام بن عبدالملک پر ایک جائداد کا دعویٰ کیا تو آپ نے ہشام کو عدالت میں طلب کیا اور کہا کہ مدعی کے برابر کھڑے ہو کر جواب دہی کرو ۔ ہشام نے وکیل مقرر کرنا چاہا ۔ آپ نے کہا نہیں تم خود سامنے کھڑے

---

[۱] سیرت عمر بن عبدالعزیز صفحہ ۱۵۵ [۲] المامون صفحہ ۱۰۹ [۳] رسائل شبلی صفحہ ۹۸

ہو کر جواب دو۔ ہشام نے عیسائی کے ساتھ سخت کلامی شروع کی تو حضرت عمر بن عبدالعزیز نے سختی سے ڈانٹا اور کہا کہ دوبارہ یہ حرکت سرزد ہوئی تو بغیر سزا دیئے نہ چھوڑوں گا۔ چنانچہ روئداد سے عیسائی کا حق ثابت تھا اس کو ڈی دلائی اور حکم دیا کہ ہشام کی وستاویز جو اس نے پیش کی تھی چاک کر دی جائے۔

مسلمان حکمرانوں کی اسی حریت پرور طرز عمل کا نتیجہ تھا کہ دوسرے ممالک کے غیر مسلم باشندے اس بات کی تمنائیں کرتے تھے کہ مسلمان ان کے ملک کو فتح کر کے ان کو ظلم سے نجات دلائیں۔

ایک مغربی مفکر لکھتا ہے کہ اسلام نے ذمیوں کو وہ تمام حقوق دیئے جو مسلمانوں کو دیئے گئے تھے سوائے اس کے کہ خلیفہ ان میں سے نہیں ہو سکتا۔

قتل مرتد

اس سلسلے میں یہ سوال خود بخود پیدا ہوتا ہے کہ جب اسلام نے دوسری اقوام کو مذہبی آزادی عطا کی ہے تو اس مسلمان کو قتل کی سزا کیوں دی جاتی ہے جو اپنی تحقیق کی غلطی و گمراہی سے اسلام کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کر لیتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ارتداد کے جرم میں لاکھوں مسلمانوں کو فقہاء کے فتووں کی وجہ سے قتل کی سزا برداشت کرنی پڑی۔ جن مسلمانوں نے اپنے ارتداد کا اعلان کیا صرف انہی کو ان سزاؤں کا شکار نہیں ہونا پڑا بلکہ اُن مغضوبین میں زیادہ تعداد ایسے مسلمانوں کی ہے جو اپنے آپ کو راسخ العقیدہ مسلمان کہتے اور تمام ارکان اسلام پر عامل تھے مگر بعض جزئیات کے اختلاف کی بنا پر قاضی کی عدالت خود ان کے مرتد ہو جانے کا فیصلہ کر کے قتل کی سزا تجویز کر دیتی تھی۔

ان کے احکامات کی بنیاد سورۂ توبہ کی پانچویں آیت کا یہ حصہ ہے :-

"مشرکوں کو جہاں پاؤ قتل کر دو اور جہاں کہیں ملیں گرفتار کر لو۔ نیز ان کا محاصرہ کر دو اور ہر جگہ ان کی تاک میں بیٹھو۔"

فی الحقیقت یہ آیت اُن اہلِ مکہ سے تعلق رکھتی ہے جنہوں نے حدیبیہ کا معاہدہ توڑ ڈالا تھا۔ اور جنھوں نے باوجود عہد و پیمان کے اس قبیلے پر سختی کی تھی جس نے ان کے خلاف معاہدہ تاخت و تاراج سے تنگ آکر مسلمانوں کے زیر سایہ پناہ لی تھی۔

آیت مذکورہ کے اس حصے سے پہلا جملہ ہی مطلب کی مکمل وضاحت کرتا ہے جو یہ ہے:۔

فاذا انسلخ الاشھر الحرام	جب حرمت کے مہینے گذر جائیں (یعنی جب جنگ کی حالت قائم ہو جائے)۔

مشرکین کی بدعہدی کا علم ہو جانے کے بعد بھی حج کے دنوں سے چار ماہ یعنی ۱۰ ربیع الاول تک کی ان کو مہلت دیدی گئی تھی۔

اس مدت کے ختم ہونے کے بعد مشرکوں کو قتل کرنے اور گرفتار کرنے کا حق دیا گیا تھا لیکن بعض فقہاء نے پورے واقعے کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف ایک حصہ کو سامنے رکھ کر ایک مسئلہ پیدا کر لیا۔

اس آیت سے پہلی آیت میں اس پورے واقعہ کی تفصیل ہے جس کے بعد اس قسم کی تاویل قابلِ افسوس معلوم ہوتی ہے پہلی آیت سے چوتھی آیت تک اس تمام واقعہ کو دہرایا گیا ہے کہ جن مشرکوں کے ساتھ مسلمانوں نے معاہدہ کیا تھا اب وہ بری الذمہ ہیں اس میں چار ماہ کی مدت، دسویں حج کے دن اس کی عام منادی کرانے اور ان لوگوں کو مستثنیٰ کرنے کا بھی ذکر ہے۔ جنھوں نے معاہدہ کی پابندی کی۔

اس غلط فہمی کی وجہ یہ ہے کہ حضرت علیؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں ایک شخص کو اس جرم میں قتل کی سزا دی تھی کہ وہ جماعت اسلامی کو چھوڑ کر مخالف اسلام گروہ میں شریک ہوگیا تھا اور اس کی اس حرکت سے فساد کا اندیشہ تھا۔ فقہاء نے آپ کے اس فعل سے قتل مرتد کا عام مسئلہ

مستنبط کر لیا - اور اس کی تائید میں قرآن کریم کی مذکورہ آیت کے ایک ٹکڑے کو اس کے سیاق و سباق سے علیحدہ کر کے پیش کرنا شروع کر دیا -

اسلام کی اجتماعی حیثیت ختم ہو جانے کے بعد اس قسم کی مشکلات فقہاء کو برابر پیش آتی رہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی تاویلات بسا اوقات مضحکہ خیز بن جاتی ہیں اور اسلام کو ہدف اعتراض و تنقید بناتی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ارتداد بذاتہٖ خود کوئی جرم نہیں ہے لیکن اگر اس سے جماعت کے اندر انتشار اور تفریق یا حکومت میں فتنہ و فساد کا اندیشہ پیدا ہو جائے تو یقیناً یہ فعل ایک سنگین جرم سمجھا جائے گا جس کی سزا حالات کے مطابق مقرر کی جائے گی - عام حالات میں معمولی سزا کافی ہوگی - لیکن جنگ کے زمانے میں جماعت کے کسی آدمی کا کٹ کر دوسری مخالف جماعت میں جا ملنا بہت سے مفاسد کا باعث ہو سکتا ہے بالخصوص جماعت کے خفیہ حالات کی اطلاع رسانی وغیرہ کا خطرہ اس سے ہو سکتا ہے اس لئے اس کو قتل کرنے کے علاوہ اور کوئی صورت نہیں رہتی اس لئے جنگ کی حالت میں یہ صورت بالکل ناگزیر ہے لیکن کسی شخص کا صرف عقائد کی رو سے مرتد ہو جانا جو انسان کی گمراہی اور تحقیق کی غلطی سے واقع ہو سکتا ہے بالکل مختلف ہے بالخصوص جبکہ اسلام کا نظام اجتماعیت دین و سیاست کی تقسیم کا شکار ہو گیا ہو اس بارے میں اسلام کی تعلیم لا اکراہ فی الدین اور لکم دینکم ولی دین - پر مبنی ہے لہٰذا اسلام جہاں دوسری اقوام کو مذہبی آزادی دیتا ہے وہیں کسی کے ذاتی عقائد کے احتساب کو بھی ضروری نہیں سمجھتا - دین کے معاملہ کو اس نے انسان کے غور و تدبر پر چھوڑ دیا ہے -

نظام اسلام کی عملی حیثیت

اسلام کا یہ نظام جس کی مختصر تفصیل اوپر بیان کی گئی ہے افلاطون کے موہوم نظریہ "حکومت آسمانی" کی طرح محض ایک تصوری حیثیت نہیں رکھتا نہ یہ کسی ایسی ناقابلِ عمل تھیوری کا نام ہے جس کا ذکر

صرف مقدس کتابوں میں پایا جاتا ہو اور نہ یہ وہ قابلِ حصول مقصد ہے جس کو قومیں آئیڈیل بنا کر صرف اس لئے اختیار کرتی ہیں کہ اس کے سہارے افراد میں یکجہتی اور اشتراک قائم رہے اور قوم کا وجود باقی رہے بلکہ یہ وہ آزمایا ہوا آئین ہے جس کے ہر پہلو کی نمائش دنیا کے سامنے کی جا چکی ہے اور جو اگرچہ اپنی پوری اجتماعیت کے ساتھ صرف نصف صدی تک قائم رہا لیکن اس کی روشنی کی دھندلی شعاعیں آج تک اقوام کے لئے چراغ رہگزر بنی ہوئی ہیں اور مادیات سے مغلوب اور زخم خوردہ انسانیت کو جو ورطۂ ہلاکت کے قریب پہنچ چکی ہے اپنی طرف متوجہ کر رہی ہیں اسلام کے ابتدائی عہد میں جب تک یہ نظام اپنی اجتماعی شکل میں نافذ رہا یا بعد میں جب کبھی عرب یا اسپین میں عمر بن عبدالعزیز یا موحدین کے مختصر زمانوں میں اس نظام کے اجراء کی کوشش کی گئی حسب توقع نتائج برآمد ہوئے اس عہد کی سوسائٹی میں بدامنی اور فساد - افلاس و نکبت کا کہیں نام تک نظر نہیں آتا - محبت رواداری امن اور خوشحالی کے ساتھ سوسائٹی کا ہر فرد اپنے فرائض میں مصروف ہے چونکہ حکومت کی بنیاد رواداری مساوات اور عدل و توازن باہمی پر قائم تھی - اس لئے ہر شخص اپنی جگہ مطمئن اور قانع تھا۔

عہد نبوت اور خلافت راشدہ کا مختصر دور اس قسم کی حکومت الٰہیہ کا صحیح نمونہ ہے جس میں ہر جگہ امن و عافیت اور محبت و رواداری کی روشنی نظر آتی ہے۔ عدل و مساوات احتساب نفس اور خشیت الٰہی کی جسقدر مثالیں اس عہد میں ملتی ہیں تاریخ کا کوئی دور اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتا۔ عدل و مساوات کا یہ عالم کہ بنی مخزوم جیسے بارسوخ و با اثر قبیلۂ عرب کی ایک عورت کو چوری کے الزام میں ہاتھ کاٹنے کی وہی سزا دی جاتی ہے جو اسلام نے مقرر کی تھی۔ بلکہ بعض صحابہ کرام کی سفارش پر رسول کریمؐ کا یہ اعلان کہ "اگر فاطمہ بھی اس جرم کا ارتکاب کرے گی تو اس کو بھی یہی سزا دی جائے گی" تاریخ عدل کا ایک سنہرہ

باب ہے۔

خدا کے مقرر کردہ اصول و قوانین کی پابندی کی یہ حالت کہ غزوۂ بدر میں آنحضرت کے عم مبارک حضرت عباس گرفتار ہو کر آتے ہیں رات کو ان کی آہ و بکا کی آواز رسول کو بے چین کرتی ہے مگر بغیر رقم فدیہ لئے ہوئے ان کی رہائی نہ ہو سکی۔

احتساب نفس اور خشیت الٰہی کا یہ عالم کہ خلیفۂ دوم اپنی بیماری میں شہد کا ایک مشکیزہ تک بیت المال سے مسلمانوں کی اجازت کے بغیر لینا گوارا نہیں کرتے اور منبر پر کھڑے ہو کر فرماتے ہیں۔

"اگر تم مجھے اجازت دو تو یہ شہد لے لوں ورنہ وہ مجھ پر حرام ہے"

آپ کی زوجہ حضرت ام کلثوم قیصر کی ملکہ کے پاس عطر کی چند شیشیاں بھیجتی ہیں۔ وہ ان کو جواہرات سے بھر کر واپس کرتی ہے حضرت عمرؓ ان سب کو بیت المال میں داخل کر دیتے ہیں کیونکہ جو قاصد ان شیشیوں کو لے کر گیا تھا وہ سرکاری تھا اور اس کے سفر کے تمام مصارف عام آمدنی سے ادا کئے گئے تھے۔ اس قسم کی نظیریں کہیں تلاش کرنے سے بھی دستیاب ہو سکتی ہیں؟ آپ کے عہد میں جب کوئی عامل مقرر کیا جاتا تو اس سے عہد لیا جاتا کہ "ترکی گھوڑے پر سوار نہ ہوگا۔ باریک کپڑے نہ پہنے گا اور اہل حاجت کے لئے دروازہ ہمیشہ کھلا رکھے گا" صرف یہی نہیں بلکہ عامل کے تقرر کے وقت اس کے پاس جس قدر اسباب و سامان ہوتا اس کی فہرست بنوائی جاتی اور اگر بعد میں اس کی مالی حالت میں غیر معمولی تغیر ہوتا تو اس سے بازپرس کی جاتی۔

اطاعت امیر کا جذبہ اس عہد میں اس حد تک سرایت کر چکا تھا کہ حضرت خالد بن ولید کو جن کی فتوحات کا سکہ تمام عراق و شام میں بیٹھا ہوا تھا۔ خاص میدان جنگ میں ایک شاعر کو

دس ہزار روپیہ انعام دینے کے الزام میں انہی کے دوپٹے سے ان کی گردن باندھ کر ان کے عزل کا اعلان کیا جاتا ہے اور دنیا کا سب سے بڑا سپہ سالار دم تک نہیں مار سکتا۔

عمرو بن عاص کے بیٹے عبداللہ کو عمرو بن عاص کی موجودگی میں ان کے ایک غلط تعزیری حکم کی سزا میں کوڑے لگوائے جاتے ہیں اور باپ بیٹے دونوں احتجاج کا ایک لفظ نہیں نکال سکتے۔

یہ صرف ایک شہنشاہ حقیقی کی حاکمیت کو نصب العین بنانے کا نتیجہ تھا کہ عرب کے تفرقہ ایجاد اور عصیاں کار بندوں کے دلوں میں وہ محیر العقول انقلاب پیدا ہو گیا تھا کہ آج متمدن دنیا ان کے اعلیٰ کردار و سیرت کو دیکھ کر حیران ہے ان کی "قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت" کو دیکھ کر انسان کا صحیح مرتبہ اور "اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً" کی صحیح تفسیر سامنے آ جاتی ہے۔ قرآن کریم ان مومنوں کی تصویر ان الفاظ میں پیش کرتا ہے: "اور مومن مرد اور مومن عورتیں آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں، نیک باتوں کی تعلیم دیتے ہیں برائی سے روکتے ہیں۔ نماز پڑھتے ہیں زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں ان لوگوں پر ضرور اللہ رحمت کرے گا۔ اللہ زبردست حکمت والا ہے۔" ۹/۷۱

اس سے بڑا شرف قبولیت اور کیا ہوگا کہ خود آقا اپنے پاکباز بندوں کی نیکیوں کو شمار کراتا ہے دوسرے موقع پر ان برگزیدہ بندوں کی صفات کو اس طرح گنایا جاتا ہے۔

"ان لوگوں کے اوصاف کا یہ حال ہے کہ اپنی لغزشوں اور خطاؤں سے توبہ کرنے والے عبادت میں سرگرم رہنے والے۔ اللہ کی حمد و ثنا کرنے والے سیر و سیاحت کرنے والے رکوع و سجود میں جھکنے والے، نیکی کا حکم دینے والے۔ برائی سے روکنے والے اور اللہ کی ٹھہرائی ہوئی حد بندیوں کی حفاظت کرنے والے ہیں (اے پیغمبر یہی سچے مومن ہیں) اور مومنوں

کو (کامیابی وسعادت کی) خوش خبری دے دو۔" ۹/۱۱۲

رسول کریم اور ان کے صحابۂ کرام کی توصیف میں سورۂ الفتح میں ارشاد ہوتا ہے:۔

"محمدؐ اللہ کا پیغمبر ہے اور جو لوگ اس کے ساتھ ہیں (یعنی صحابہ) وہ کافروں پر سخت اور آپس میں (ایک دوسرے پر) رحمدل ہیں (اسے دیکھنے والے) تو ان کو دیکھتا ہے (کبھی) رکوع کر رہے ہیں (کبھی) سجدہ کر رہے ہیں۔ اللہ کے فضل اور اس کی رضامندی کی فکر میں رہتے ہیں ان کی نشانی ان کے چہروں پر ہے" ۴۸/۲۹

ان کے ایمان کا یہ حال ہے کہ آشوب حوادث کا کوئی انقلاب ان کو غمگین و پریشان نہیں کر سکتا وہ بلاخوف وخطر اپنے نصب العین کی طرف متواتر وپیہم بڑھتے رہے ہیں۔

أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ط الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ ط لَهُمُ الْبُشْرَىٰ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ ط ۱۰/۶۴

یاد رکھو جو اللہ کے دوست ہیں ان کے لئے نہ تو کسی طرح کا خوف ہوگا نہ کسی طرح کی غمگینی، یہ وہ لوگ ہیں کہ ایمان لائے اور زندگی ایسی بسر کی کہ برائیوں سے بچتے رہے ان کے لئے دنیا کی زندگی میں بھی (کامرانی وسعادت کی) بشارت ہے اور آخرت کی زندگی میں بھی۔

یہ ان مسلمان مردوں کے متعلق تھا لیکن قرآن مجید کا انقلاب کس قدر حیرت انگیز تھا کہ وہی عورتیں جو کبھی اپنے مردوں سے زیادہ جاہل تھیں اب قرآن مجید کے الفاظ میں "مومنات، قانتات، تائبات، عابدات، سالحات کے اوصاف سے مزین ہیں۔

سورۂ انفعال میں خداوند کریم نے مسلمانوں کو نصیحت فرماتے ہوئے چھ باتوں پر زور

دیا ہے کہ وہی فتح و کامرانی کا سرچشمہ ہیں۔ فرمان خداوندی کے پورے الفاظ پر غور کرو اور دیکھو کہ قرون اولیٰ کے یہ فرشتہ صفات انسان اپنی زندگی کے ہر لمحے میں ان تمام نصائح پر کس حد تک کاربند و عمل پیرا ہیں۔ ارشاد ہوا ہے:۔

" اور اللہ اور اس کے رسول کا کہا مانو، آپس میں جھگڑا نہ کرو۔ ایسا کروگے تو تمہاری طاقت سست پڑ جائیگی اور ہوا اکھڑ جائیگی اور (مصیبتوں پر) صبر کرو۔ اللہ ان کا ساتھی ہے جو صبر کرنے والے ہیں۔

" مسلمانو! جب (حملہ آوروں کی) کسی جماعت سے تمہارا مقابلہ ہو جائے تو لڑائی میں ثابت قدم رہو، اور زیادہ سے زیادہ اللہ کو یاد کرو تاکہ تم کامیاب ہو اور (دیکھو) ان لوگوں جیسے نہ ہو جاؤ جو اپنے گھروں سے (لڑنے کے لئے) اتراتے ہوئے اور لوگوں کی نظروں سے نمائش کرتے ہوئے نکلے۔ اور جن کا حال یہ ہے کہ اللہ کی راہ سے (اس کے بندوں کو) روکتے ہیں اور (یاد رکھو) جو کچھ بھی یہ لوگ کرتے ہیں اللہ (اپنے علم و قدرت سے) اس پر چھایا ہوا ہے " (۸ - ۴۵ - ۴۶)

احکامات الٰہیہ کے الفاظ کو پھر پڑھو اور بار بار اس غرض سے پڑھو کہ شمع محمدی کے ان پروانوں کے جنون توحید کی حد کہاں تک ہے۔ مومنین کی اس قابل رشک جماعت کی اطاعت کوشی اور عشق جہاد فی سبیل اللہ کا یہ عالم ہے کہ اعلان جہاد ہوتے ہی مقداد بن اسود جیسا ضعیف و ناتواں بوڑھا بھی جس کی سفید بھویں آنکھوں پر آگری تھیں بلا وجہ حکم معذوری و معافی کے اَنفِروا خفافاً وثقالاً کہتا ہوا نکل کھڑا ہوتا ہے۔ عورتوں تک کا یہ حال کہ بیک وقت ان کے بھائی، باپ اور خاوند کی شہادت کی خبر پہنچائی جاتی ہے اور وہ بے اختیار ہو کر کہتی ہیں " کل مصیبۃ بعدک جلل " تیری سلامتی کے بعد سب

مصیبتیں سہل ہیں۔

عہد جاہلیت کی مشہور شاعرہ خنساؔ جس نے اپنے بھائی صخرؔ کے غم میں ایسے درد انگیز مرثیے کہے تھے کہ کوئی شخص ان کو سن کر بغیر روئے نہیں رہ سکتا تھا۔ اب اس قدر بدل چکی ہے کہ جنگ قادسیہ میں خود شریک ہو کر اپنے چاروں بیٹوں کو جہاد کے لئے رخصت کرتے ہوئے کہتی ہے۔

"پیارے بیٹو! تم اپنے ملک کو دو بھر نہ تھے۔ نہ تم پر قحط پڑا تھا باوجود اس کے تم اپنی بوڑھی ماں کو یہاں لائے اور فارس کے آگے ڈال دیا۔ خدا کی قسم جس طرح تم ایک ماں کی اولاد ہو اسی طرح ایک باپ کے بھی ہو میں نے تمہارے باپ سے بددیانتی نہیں کی۔ نہ تمہارے ماموں کو رسوا کیا۔ لڑو جاؤ اور اخیر تک لڑو"

پھر جب جنگ یرموک میں اپنے تمام لڑکے ایک ایک کر کے کٹوا دیتی ہے اور جب آخری لڑکا بھی شہید ہو چکتا ہے تو پکار اٹھتی ہے۔ الحمد للہ الذی اکرمنی بشہادتھم!۔

اطاعت خدا اور رسول، جہاد میں ثابت قدمی و صبر و استقامت اور توکل علی اللہ کی ان سے بڑھ کر اور کیا شہادت ہو سکتی ہے۔ خود خدائے تعالیٰ نے ان الفاظ میں اس حقیقت کا اظہار فرمایا ہے :-

" بلاشبہ اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں بھی خرید لی ہیں اور ان کا مال بھی اور اس قیمت پر خرید لیں کہ ان کے لئے بہشت کی جاودانی زندگی ہو وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں پس مارتے بھی ہیں اور مرتے بھی ہیں۔ یہ وعدہ اللہ کے ذمہ ہو چکا (یعنی اس نے ایسا ہی قانون ٹھہرا دیا) توریت۔ انجیل اور قرآن میں اس کا اعلان ہے اور اللہ سے بڑھ کر

کون ہے جو اپنا عہد پورا کرنے والا ہو؟ پس (مسلمانو) اس سودے پر جو تم نے اللہ سے چکایا خوشیاں مناؤ اور یہی ہے وہ بڑی سے بڑی فیروزمندی ہے" ۹/۱۱

سیرت انسانی کا اس سے بلند دیر تو معیار زمانے نے نہ اس مختصر مبارک دور سے قبل کبھی دیکھا تھا نہ بعد میں دیکھنا نصیب ہوا۔

سعادت و کامرانی کی بارشیں اللہ کی ناقابلِ تبدیل سنت کے موافق ہر عمل کا ایک لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔ اطاعت امیر، ایثارِ نفس اور اتقائے خدا کا لازمی نتیجہ کفر و ظلمت کی شکست اور غلبۂ ایمان ہے مومن ہونے کا فطری انجام، اعلون بنتا ہے (انتم الاعلون ان کنتم مومنین)، خدا کی صالح امت بن جانے کا یقینی حاصل زمین کی وراثت و استخلاف فی الارض ہے —

(ان الارض یرثہا عبادی الصالحون) ؎

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث　　مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

(اقبالؒ)

دنیا میں قوانین الٰہیہ کے نفاذ و اجرا کی تمام کوششیں، کفر کو مٹا کر تمام روئے زمین کو ایمان سے پُر کر دینے کی جملہ مساعی خود انسان کی اپنی زندگی سنوارنے، اپنے خیالات و افکار میں طہارت و پاکیزگی پیدا کرنے اور فتنہ و فساد کو مٹا کر امن قائم کرنے کے لئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی صفات پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا جو ہر چیز سے بے نیاز ہے۔

وَمَن جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ ۲۹	اور جو کوئی محنت کرتا ہے وہ خود اپنے فائدے کے لئے کرتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ سارے جہاں سے بے پرواہ ہے۔

جن مسلمانوں نے خدا کی اطاعت و تابعداری میں ایک دوسرے سے سبقت لیجانے کی کوشش کی اسی کے لئے اپنے گھربار چھوڑے اور اپنے مال اور جان حکومت آلٰہیہ کے قائم کرنے کی کوشش میں صرف کر دیئے ان سے زیادہ خدا کی رحمت کا اور کون مستحق ہو سکتا تھا۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۲/۲۱۸	یقیناً وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور خدا کے راستے میں جہاد کیا وہی رحمت خداوندی کی امید کر سکتے ہیں۔ وہ اللہ غفور الرحیم ہے۔

اللہ کی اطاعت و وفاداری اور صرف اسی سے مدد مانگنے کے صلے میں دوسرے موقع پر اس طرح خوشخبری دی گئی ہے:۔

فَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ فَلَهُ أَسْلِمُوا ۗ وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِينَ ۲۲/۳۴	تمہارا خدا وہی ایک خدا ہے اسی کے تابعدار رہو اور (اے پیغمبر) گڑگڑانے والوں کو (عاجزی کرنے والوں کو) سعادت و کامرانی کی، خوشخبری دیدو۔

تاریخ شاہد ہے کہ خداوند کریم کی خوشخبریوں کا ایک ایک لفظ پورا ہو کر رہا عرب کی وہی بُت پرست قوم جو مہذب اقوام میں شمار بھی نہ کی جاتی تھی۔ معمولی عرصے میں تمام متمدن دنیا پر چھا گئی وہی انسان جو مٹی کے خود ساختہ بتوں کے سامنے ہزاروں مرتبہ جھک چکے تھے اب ایمان و خودی کے نشے میں سرمست ہو کر دنیا کی کسی طاقت کے سامنے سر اطاعت خم کرنا نہ

جاتے تھے۔ قیصر و کسریٰ کے تخت و تاج ان کے اشاروں سے توڑے اور تقسیم کئے جاتے تھے۔ دنیا کی کوئی حکومت ان کی ہمت رفعت طلب کے سامنے ٹھہرنے کی جرأت نہ کرتی تھی روئے زمین پر کوئی مقام ایسا نہ تھا جہاں ان کے قدم خدا کا پیام لیکر نہ پہنچے ہوں قیام حق و دفع باطل کے لئے کوہ و دشت دریا و ریگستان کی کوئی تمیز انہوں نے نہ چھوڑی تھی۔

" ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست " (الارض للہ) کے پر از انقلاب نعروں کے ساتھ ان کی کشتیاں ریگستانوں میں چل گئیں اور تاریک و پرخطر دریاؤں میں گھوڑے ڈالکر ان کو عبور کر ڈالا۔

۵۰ برس کے عرصے میں انہوں نے ہزاروں قلعے اور شہر فتح کر ڈالے اور اس معمولی مدت میں ان کی فتوحات کی وسعت حدود بحر قلزم سے بحر اسود تک اور بحر روم سے ترکستان تک جا پہنچی۔ دین و دنیا کی کونسی فلاح و کامرانی تھی جو ان مجاہدین اسلام کے قدموں پر نہ تھی، فیضان و سعادت کی کونسی روشنی تھی جس سے ان نفوس قدسیہ کے قلوب منور نہ تھے افلاس و فتنہ و فساد دنیا سے مٹ چکے تھے امن کی یہ حالت تھی کہ ایک سوت کاتنے والی بڑھیا بغداد سے مکہ تک سونا لے کر سفر کر سکتی تھی اور کوئی ٹوکنے والا نہ تھا مرفہ الحالی اور خودداری کی یہ کیفیت کہ ع منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا۔

اس سے زیادہ خوشحالی اور خوشحالی سے زیادہ خودداری، قناعت و اطمینان قلب کا نمونہ دنیا نے کبھی دیکھا تھا ؟

ایک طرف جہنم زار عالم گلزار جنت بن چکا تھا دوسری طرف خیالات اور افکار کی ویرانی صحیح تخیلات و تیقنات کی شادابی میں بدل چکی تھی

عصرکہن کی تمام خام خیالیاں ان کی تیغ ناصبور کے سامنے خود بخود مٹ چکی تھیں ان کے نعرہائے آتشناک نے دہرفرسودہ کی تمام رسومات و توہمات کو انبارخس وخاشاک کی طرح جلا ڈالا تھا۔ قیاسات و مظنات کی جگہ یقین و ایمان کی حقیقت نے لے لی تھی جہالت کی ظلمت ختم ہو کر علم و تحقیق کا آفتاب طلوع ہو چکا تھا غرور و پندار کا بُت ٹوٹ چکا تھا نفس و شیطان کے خدع و فریب ہمیشہ کے لئے گم ہو چکے تھے۔ غرضیکہ انسان علم و عشق کی تمام ارتقائی منازل طے کر کے انسان کامل بن چکا تھا۔ حضرت اقبالؒ نے یہ شعر اسی انسان کامل کے لئے غالباً کہا تھا ؎

عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں!
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے

لیکن اس کے باوجود انسان کی کہیں حکومت نہ تھی۔ اس نے عبدیت کی منزل سے آگے ایک قدم نہ بڑھایا تھا۔ ہر جگہ خدا کی حکومت تھی اسی کا ملک تھا اس کی سلطنت تھی اور اسی کا قانون و آئین تمام روئے زمین پر نافذ تھا۔

انحطاط اور اس کے اسباب

بدقسمتی سے ملوکیت پرست اور خود غرض افراد کی وجہ سے یہ دور زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکا اور تھوڑے ہی عرصہ میں امپیریلزم مختلف شکلوں میں نمودار ہو کر پوری تحریک پر چھا گئی۔

ظہور اسلام کے وقت کرۂ ارض کا تقریباً ہر حصہ جہالت اور غلامی کی ظلمت میں مبتلا تھا۔ مصر و بابل، یونان و روم اور ایران کے تمدن آپس میں ٹکرا کر پاش پاش ہو چکے تھے۔ پوری انسانیت ملوکیت و استبداد کے بوجھ سے کراہ رہی تھی۔ مذہبی رہنماؤں اور بادشاہوں کی پرستش اس قدر عام تھی کہ ہر ملک ہر قوم اور سوسائٹی کا ہر فرد غلامی کی کسی نہ کسی شکل میں ضرور پھنسا تھا۔ اس وقت تمام نظاموں نے باطل کو توڑ کر اسلام کا مکمل معاشی، معاشرتی اور اخلاقی نظام قائم کر دینا پیغمبر اسلام کا اتنا بڑا معجزہ ہے کہ اس کی مثال دنیا کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی یہ نظام آنحضرت کی وفات کے بعد بھی تقریباً تیس سال تک یعنی اس وقت تک اسی طرح قائم رہا جب تک وہ ان افراد کے ہاتھوں چلتا رہا جو اسلام کی پوری تحریک کے نشیب و فراز سے واقف اور اس کی تمام پیچیدگیوں کو سمجھتے تھے اور جن کی سیرت کی تعمیر اسی نظام کے ماتحت ہوئی تھی جیسے ہی حکومت اسلامی ان لوگوں کے ہاتھوں میں پہونچی جو یا تو فتح مکہ کے بعد اسلام لائے تھے اور جن میں بنو امیہ کے افراد کی ایک کثیر جماعت بھی شامل تھی یا جن لوگوں کو براہ راست تعلیمات اسلامی کو پیغمبر اسلام سے سمجھنے کا ایسا موقع نہ مل سکا تھا۔ اسلام میں افراط و تفریط کے دروازے کھلنا شروع ہو گئے۔ ایک عالمگیر تحریک کے لئے سب سے زیادہ نازک اور اہم مرحلہ اس وقت آتا ہے جب اس کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کی وجہ سے غیر تربیت یافتہ عوام جوق در جوق اس میں داخل ہونے لگتے ہیں اسلام کے سامنے جب ایران مصر اور اسپین نے ہتھیار ڈال دیئے تو ان ممالک کے عوام نے لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں اسلام قبول کرنا شروع کر دیا۔

لیکن اتنی بڑی تعداد کی اسلامی تربیت کا فوری انتظام ممکن نہ تھا۔ اس لئے وہ اپنے قدیم روایات کو ساتھ لے کر اسلام میں آئے اور بجائے اس کے کہ اسلامی تحریک سے وہ خود متاثر ہوتے انہوں نے اسلامی نظام ہی کو عجمی اور رومی رنگ میں رنگنا شروع کر دیا۔ بد قسمتی سے انہوں نے اسلامی ادارۂ خلافت کو بادشاہت خلیفہ کو بادشاہ اور خود اسلام کو ایک نجی عقیدہ اور انفرادی نجات کا ذریعہ سمجھ لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خلافت کے ادارے کو تخت ملوکیت میں تبدیل کر دیا گیا اور اسکے حصول کے لئے ان تمام وسائل و ذرائع کو کام میں لایا جانے لگا جو ملوکیت کے ساتھ وابستہ ہیں۔ حضرت عثمانؓ کے زمانہ خلافت کے آخر سالوں ہی میں بنو امیہ کے ان افراد کا اثر اور تسلط خلافت کے مختلف محکموں اور شعبوں پر ہو چلا تھا جن کو آنحضرت صلعم سے براہ راست اکتساب کا موقع کم یا بالکل نہیں ملا تھا۔ اس لئے وہ لوگ اسلامی تحریک کی افضلیت سے کماحقہٗ واقف نہ تھے قرآن کریم میں بھی ان لوگوں پر جو فتح مکہ کے بعد اسلام لائے۔ پہلے اسلام لانے والوں کو ترجیح دی گئی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:۔

لا یستوی منکم من انفق من قبل الفتح وقاتل اولئک اعظم درجۃ من الذین انفقوا من بعد وقاتلوا ؕ	تم میں سے جن لوگوں نے فتح مکہ سے قبل خرچ کیا اور لڑے وہ برابر نہیں ہیں ان کا درجہ ان کا درجہ ان لوگوں سے بڑا ہے جنہوں نے بعد میں خرچ کیا اور لڑے۔

انہی اصحاب میں امیر معاویہ اور مروان بھی تھا۔ امیر معاویہ ان سب میں بہتر اور سمجھدار تھے اور فتح مکہ کے بعد کچھ دنوں کے لئے آپ کو آنحضرت کے کاتب وحی کی حیثیت سے آپ کے قریب رہ کر اسلام کو سمجھنے کا موقع بھی مل چکا تھا لیکن خلفاء راشدین

کی طرح اسلامی سیاست اور خلافت آلٰہیہ کی پیچیدگیوں کو آپ نہ سمجھ سکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت علیؓ کے انتخاب خلافت کے بعد ہی آپ نے حضرت عثمانؓ کی شہادت اور اُن کے خون کے قصاص کو بہانہ جنگ بنا کر نہ صرف خلافت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور اس طرح اسلامی سیاست میں زبردست خانہ جنگی کا دروازہ کھول دیا بلکہ حضرت علیؓ کی مخالفت اور حصول تخت حکومت کی جدوجہد میں وہ تمام مذموم ذرائع اور وسائل استعمال کئے جن کی اسلام کفار کے مقابلے میں بھی اجازت نہیں دیتا۔

بیت المال کے خزانوں کو اپنے ذاتی مقاصد کے لئے بے دریغ خرچ کیا گیا۔ حضرت علیؓ کے ساتھیوں کو اپنی طرف بلانے اور اپنی پوزیشن کو مستحکم کرنے کے لئے خوب روپیہ صرف کیا گیا۔ عمرو بن عاص کو جن شرائط کے ساتھ اپنے ساتھ ملایا گیا اور حضرت حسنؓ سے جن شرائط پہ صلح کی گئی ان کی تفصیلات تمام تواریخ میں موجود ہیں۔ پھر یزید کو اپنی حیات میں جس طرح جانشین کیا اور مسلمانوں سے زبردستی بیعت لی۔ حضرت علیؓ کو مسجد میں جمعہ کے خطبوں کے بعد جس طرح بُرا بھلا کہنے کی رسم جاری کی اور اس سلسلہ میں حجر بن عدی اور ان کے ساتھیوں کو جس طرح شہید کیا اس کی کوئی مدافعت نہیں کی جا سکتی ان تمام اقدامات کا نتیجہ یہ ہوا کہ امیر معاویہ کی زندگی ہی میں خلافت ملوکیت میں تبدیل ہو گئی بیت المال کا جماعتی فنڈ جس پر اسلامی نظام معیشت کی بنیاد ہے خلیفہ کا ذاتی سرمایہ (Privy Purse) بن گیا۔ حکومت اور اس کے تمام ذرائع بادشاہ کی جائداد بن گئے اور اس کے جانشین کے انتخاب یا تقرر کا حق امت سے نکل کر خود بادشاہ کے ہاتھوں میں آگیا۔ یزید کو اپنی زندگی میں ولی عہد بنانے کی بدعت بذاتِ خود امیر معاویہ کی اتنی شدید غلطی تھی کہ اسلام کو جو نقصان اس سے پہنچا اس کی تلافی آج تک نہیں ہو سکی۔ بنو اُمیہ کے خاندان میں حکومت

کا مجبوس ہو جانا اسلام کے لئے سم قاتل ثابت ہوا۔ اسلام کا جمہوری نظام ختم ہو گیا اور اس کی جگہ ایسی ہی بادشاہت قائم ہو گئی جیسی ایران و روم میں اس وقت قائم تھی جب اسلام کا ظہور ہوا تھا جس کو مٹانے کا دعویٰ پیغمبر اسلام نے کیا تھا۔ امیر معاویہ کے بعد سے تقریباً تیرہ سو برس تک یعنی جنگ خلافت کا برائے نام ادارہ قائم رہا حکومت ایک خاندان سے دوسرے خاندان میں منتقل ہوتی چلی آئی پہلی صدی ہجری میں ہی سوسائٹی کے ہر طبقہ میں حتیٰ کہ ملوکیت پر علماء کی بڑی جماعت میں خاندانی حکومت اور خلیفہ کو اپنی زندگی میں اپنے ولی عہد کے مقرر کرنے کا حق اس حد تک جڑ پکڑ چکا تھا کہ عمر بن عبدالعزیزؒ اور مامون الرشید جیسے خلفا نے اس رسم کو بدلنا بھی چاہا تو ان کو بری طرح ناکام ہونا پڑا۔

ملوکیت کی یہ بنیادی رسم قائم ہوتے ہی اس کے تمام لوازمات و خصوصیات اسلام میں داخل ہو گئے اور جس بنیاد کو امیر معاویہ نے اپنے ہاتھوں سے غیر دانستہ قائم کیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس پر ملوکیت کی اتنی بڑی عمارت کھڑی ہو گئی کہ اس نے اسلام کے پورے نظام کو درہم برہم کر دیا۔ اس کا سب سے پہلا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام اور خلیفہ میں براہ راست جو رابطہ قائم تھا ختم ہو گیا۔ خلیفہ نے خود کو بادشاہ اور حاکم اور عوام کو اپنی رعایا اور محکوم سمجھنا شروع کر دیا۔ امیر معاویہ نے اپنی زندگی میں ضعیف العمری کا عذر کر کے عوام سے خود کو ممتاز کر کے تخت پر بیٹھنا شروع کیا تھا اور دارالخلافت میں اپنی ڈیوڑھی پر حاجب مقرر کئے تھے لیکن رفتہ رفتہ یہی تخت مقدس تخت شاہی بن گیا جس پر بیٹھے ہوئے بادشاہ کی زیارت زمین بوسی اور اس کے لئے سجدہ تعظیمی عین سعادت سمجھی جانے لگی۔ خلیفہ تک عوام بلکہ خواص تک کا پہنچنا ناممکن ہو گیا۔ خلیفہ کا دربار قیصر و کسریٰ کے درباروں سے بڑھ گیا۔ خلفا کے رہنے کے محلات اور عمارتیں بلکہ ان کے دفن ہونے کے مقبرے اور قبرستان عجائب روزگار

بن گئے خلفاء کے ساتھ سلاطین، وزراء اور امراء کی عیش پسندیاں اور عشرت پرستیاں بھی کم نہ تھیں۔ ان سب کے محلات اور حرم سرا کنیزوں، غلاموں اور مغنیوں سے پُر رہنے لگے اور اس طرح سوسائٹی کا بڑا حصہ جو خود کو قومی ذمہ داریوں سے بری اور حکومت کو خلیفہ کی ملک سمجھ چکا تھا اب صرف ان کی تفریحات کے سامان مہیا کرنے میں مصروف ہو گیا۔

شخصی حکومت کا نتیجہ بہت جلد استبداد اور آمریت کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اب خلیفہ اور سلطان کا حکم بجائے الٰہی قانون کے سمجھا جانے لگا۔ سلطان کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ قانون اور اس کے حکم کی اطاعت خدا کی اطاعت کے مرادف ہو گئی۔ بظاہر قرآنی احکام جاری تھے لیکن چونکہ فقہا کی بڑی اکثریت ملوکیت کے استبداد سے مرعوب ہو کر اور کچھ مراعات خسروی سے پابزنجیر ہو کر سلطانی حقوق کی محافظ ہو چکی تھی اس لئے ایسے تمام قوانین کی تاویلیں گڑھ لیں گئیں جن سے ملوکیت کے نظام پر ضرب پڑتی تھی جن علماء حق اور داعیان اسلام نے صدائے حق بلند کی تو ان حکمرانوں نے انہی علماء کے فتاوؤں کی مدد سے ان پر مظالم و مصائب کے وہ پہاڑ توڑے کہ عوام بھی لرز اٹھے، سعید بن جبیرؒ ابن ابی ذئبؒ اور امام حنبلؒ سے لے کر امام ابن تیمیہؒ، مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہؒ کے زمانہ تک علماء حق اسی طرح برابر ملوکیت و ملائیت کی سازش کا شکار بنتے رہے۔ درباری علماء نے نظام ملوکیت اور خاندانی وراثت خلافت کی اس حد تک حمایت کی کہ عثمانی حکومت کے مشہور تاجدار محمد فاتح قسطنطنیہ کے زمانے میں ان سب نے ملکر یہاں تک فتوی دے دیا کہ سلطان کے لئے بالکل جائز ہے کہ تخت نشین ہوتے ہی فساد اور بدامنی کو روکنے کی غرض سے اپنے تمام بھائیوں کو بلا کسی قصور کے قتل کرا دے۔ یہ قانون "خونیں قانون" کے نام سے مشہور ہے اور اب تک سلاطین عثمانی کے دامن پر بدترین دھبہ بنا ہوا ہے۔ حکومت و خلافت کو اپنے خاندان اور نسل میں محفوظ

رکھنے کی خاطر تقریباً ہر خاندان نے ہر ملک میں دوسرے مسلم افراد کا جو کسی طرح بھی تخت و تاج کے لئے خطرہ بن سکتے تھے جس قدر خون بہایا گیا وہ مسلم تاریخ کا نہایت المناک باب ہے۔ واقعہ کربلا سے لیکر سقوط خلافت تک جس قدر مثالیں بھی ظلم و استبداد کی مسلم تاریخ میں ملتی ہیں وہ کم و بیش تمام ہی حکومت کو اپنے خاندان یا نسل میں محفوظ رکھنے کی غرض سے وابستہ ہیں۔

خلفاء کے حقوق خداداد (**Divine Rights**) ان کے جبروت اور استبداد کی بہترین مثال کے طور پر خلیفہ الناصر ۵۷۶ھ تا ۶۲۲ھ کا یہ پروانہ تقرری پیش کیا جا سکتا ہے جو اس نے اپنے ایک وزیر کو مقرر کرتے وقت اسکو عطا فرمایا تھا اس پروانہ کے الفاظ یہ ہیں۔

"محمد بن برزالقی تمام اطراف مملکت میں اور تمام رعایا میں ہمارا نمائندہ ہے پس جو اسکی اطاعت کرتا ہے وہ ہماری اطاعت کرتا ہے اور جو ہماری اطاعت کرتا ہے وہ خدا کی اطاعت کرتا ہے اور جو خدا کی اطاعت کرتا ہے خدا اسکو جنت میں داخل کرتا ہے بخلاف اسکے جو ہمارے وزیر کی نافرمانی کرتا ہے وہ ہماری نافرمانی کرتا ہے اور جو ہماری نافرمانی کرتا ہے وہ خدا کی نافرمانی کرتا ہے۔ اور جو خدا کی نافرمانی کرتا ہے۔ وہ اس کو دوزخ میں داخل کرے گا۔" [۱]

لیکن باوجود اس شوکت و سطوت کے یہ واقعہ ہے کہ مسلم سیاست کے کسی دور میں بھی سلطان یا خلیفہ کو الوہیت سے متصف کر کے اس کی عبادت نہیں کی گئی جس طرح یونان و روم اور مصر و ہندوستان میں عام طور سے کی جاتی تھی رومن تہذیب نہ صرف عہد قدیم کے تمدن کی بہترین نمائندہ سمجھی جاتی ہے بلکہ عصر حاضر کا تمدن بھی رومن قانون، فلسفۂ سیاست، مدنیت زبان اور کلچر کا بڑی حد تک ممنون ہے۔ ماقبل اسلام کے تمام

[۱] ہسٹری آف دی عربس از فلپ ۔ کے ہٹی ۔ مطبوعہ لندن ۱۹۳۷ء صفحہ ۱۵۱

تمدنوں میں سب سے زیادہ رومن تمدن کا یہ دعویٰ رہا ہے کہ اس کی بنیاد مساوات، رواداری محبت اور اخلاق پر رہی ہے لیکن بادشاہ کی پرستش کا یہ عالم تھا کہ ٹائبریس نے ایشیا کے ایک شہر کے باشندوں کی سیاسی آزادی صرف اس لئے سلب کر لی تھی کہ انہوں نے شاہ اغسطس کی پرستش میں پہلو تہی کی تھی[1]۔ کیلیگولا خود کو واقعی خدا سمجھتا تھا۔ حتیٰ کہ اکثر مجسموں سے مشہور دیوتا جیوپیٹر (مشتری) کی تصویر اتروا کر اپنی تصویر لگوادی تھی۔ لیسکی لکھتا ہے :۔

"ٹائبریس کے زمانہ میں ایک عام دستور ہوگیا تھا کہ غلام و ملزمین اپنے ہاتھ میں بادشاہ کی تصویر لئے لیتے تھے اور اس پر مطمئن و بے خوف ہوکر جو کچھ منہ میں آتا حکام عدالت یا اپنے آقاؤں کو سنا ڈالتے۔ اسی کے عہد میں ایک مرتبہ کسی شخص نے بادشاہ کی تصویر والی انگوٹھی پہنے ہوئے کسی غلیظ برتن کو چھو لیا اور اس جرم میں اسے فوراً سزا ملی۔ ایک اور شخص پر اس زمانے میں اس بات پر مقدمہ چلایا گیا کہ اس نے اپنے باغ کے ساتھ بادشاہ کا وہ بت بھی فروخت کر ڈالا تھا جو اس میں نصب تھا۔ آخری زمانے میں ایک عورت کو سزائے موت دیدی گئی کہ وہ شاہ ڈومیشین کے بت کے سامنے برہنہ ہوگئی تھی اور اغسطس کے بت کے سامنے غلام کو زدوکوب کرنا یا برہنہ ہوجانا انسان کو سزائے موت کا مستوجب کر دیتا تھا۔" شہنشاہوں کو خدایان کرام کی عام پرستش کے باوجود عوام کے ساتھ ہمدردی اور محبت کا برتاؤ رومی حکومت میں بالکل مفقود تھا۔

رومی شہنشاہوں کی خون آشام طبیعتوں اور سفاکیوں کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ انسانی خون بہانے اور مردوں اور عورتوں کو بے گناہ صرف تفریح طبع کی خاطر ذبح ہوتے

---

[1] تاریخ اخلاق یورپ جلد اول از لیسکی مترجمہ اردو از مولانا عبدالماجد دریابادی ص۲۱۵ [2] ایضاً ص۲۱۶

ہوئے دیکھنے میں ان کو ایسا ہی لطف آتا تھا جیسا کہ ایک شکاری کو جانوروں کو ذبح کرتے وقت آتا ہے چنانچہ شہنشاہ کلاڈلین کے متعلق لیکی لکھتا ہے کہ اس کو مقتولوں کے حالت نزع کے تماشے میں خاص لطف آتا تھا اور وہ دم توڑنے والے شخصوں کے چہرے کو خاص دلچسپی و شوق سے بغور دیکھا کرتا تھا۔

سیافی کا کھیل بادشاہوں اور امراء کے درباروں میں بڑے شوق سے کیا جاتا تھا جس میں انسانوں کو کبھی زندہ شیروں اور ریچھوں کے مقابلے میں اور کبھی تلواروں اور ہتھیاروں سے مسلح کر کے انسانی جوڑوں کو باہمی جنگ آزمائی کے لئے چھوڑ دیا جاتا تھا۔ جو شخص اپنے حریف کو مار ڈالتا وہ فاتح سمجھا جاتا تھا یہ کھیل اس قدر عام تھے کہ شاید کوئی میلہ اور تہوار یا خاص جشن ایسا نہ ہوتا تھا جس میں اس قسم کے تماشے نہ ہوتے ہوں۔ لیکی ان تماشوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

" اریلین نے اپنی فتح کی خوشی میں ۸۰۰ جوڑیں لڑائیں۔ ٹرنجن نے جو تماشہ عرصہ تک جاری رکھا اس میں دس ہزار آدمیوں کو لڑنا پڑا۔ نیرو نے ایک شب کو اپنے باغ میں اس طرح روشنی کرائی کہ عیسائیوں کی قمیصوں پر تیل چھڑک کر ان میں آگ لگا دی ڈومیٹس کے زمانے میں ملک بھر کے ضعیف الجثہ لوگوں کے باہمی مقاتلے کی سیر دیکھی گئی اور ایک سے زائد بار عورتوں کو سیافی کے اکھاڑے میں اترنا پڑا ایک مرتبہ ایک قیدی کو صلیب میں جکڑ کر اس پر ایک ریچھ چھوڑ دیا گیا۔ ایک اور قیدی کو یہ سزا دی گئی کہ جلتے ہوئے شعلے میں اپنا ہاتھ داخل کر دے غرضیکہ اہل روم میں خون آشامی اس درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ بڑے سے بڑے خونیں مناظر کے نظارے سے بھی یہ پیاس نہیں بجھتی تھی۔ اس کے لئے بادشاہوں کو نئے نئے طریقے سفاکیوں و خونریزیوں کے ایجاد کرنے

پڑھتے تھے" ؎

پھر آگے چل کر یہی مورخ لکھتا ہے:۔

ایک مرتبہ فلامینس کے یہاں کوئی مہمان آکر اترا۔ اس کی تفریح کے لئے میزبان نے جہاں اور سامان کئے وہاں ایک غلام کے ذبح کئے جانے کا تماشہ بھی اسے دکھایا۔

ویڈلیس پولیو نے مچھلیاں پالیں اور ان کا لقمہ اپنے غلاموں کا گوشت قرار دیا۔ ؎۲

مسلم سیاست کی پوری تاریخ میں اس قسم کا شاید ایک واقعہ بھی نہیں نکل سکتا اس میں شک نہیں سفاکی اور خونریزی کے واقعات کی کمی مسلم ملوکیت کے زمانے میں بھی نہیں ہے اور تقریباً ہر عہد میں مظالم اور خوں آشامیوں کے بے شمار واقعات ملتے ہیں لیکن یہ تمام مظالم یا تو تخت وتاج کی حفاظت کے لئے حریفان حکومت اور مدعیان سلطنت پر کئے جاتے تھے یا چوتھی صدی کے بعد ان مسلمانوں پر جن کو علماء مرتد قرار دیتے تھے مسلم تاریخ کے سب سے بڑے جابر اور ظالم عامل حجاج بن یوسف کے عہد میں بھی کوئی واقعہ ایسا نہیں ملتا جس میں صرف اپنی تفریح طبع کے لئے انسانی خون کو روا رکھا گیا ہو۔

علوم اسلامی پر بیرونی اثرات سیاسیات کی طرح افکار و نظریات اسلامی پر بھی ایران و روم و یونان کے خیالات نے بہت اثر ڈالا۔

قرآن وحدیث وفقہ قرآن مجید کی آیات کو جمع کرنے کا عام رجحان آنحضرت کے عہد میں ہی تھا خلیفہ اول کے عہد میں آیات قرآنی کو یکجا منظم کیا گیا لیکن تدوین وترتیب کی تکمیل حضرت عثمانؓ کے عہد میں ہوئی اس وقت سے

؎۱ تاریخ اخلاق یورپ صفحہ ۲۴۶ ؎۲ ایضاً صفحہ ۲۵۵

آج تک وہی ترتیب آیات و سُوَر قائم ہے۔ اس پر مسلم اور غیر مسلم مورخوں کا قطعی اتفاق ہے کہ دنیا میں صرف قرآن کریم ہی وہ کتاب ہے جس میں گزشتہ ساڑھے تیرہ سو برس میں ایک شوشے اور نقطے کی تبدیلی بھی نہیں ہو سکی، لیکن اس کے مطالب و معانی میں مفسرین نے تاویلات و تشریحات کے ذریعے اس قدر پیچیدگیاں پیدا کر دیں کہ اسلام کی سادہ اور فطری تعلیمات کو فلسفیانہ موشگافیوں اور منطقی کاوشوں میں الجھا دیا۔ غیر مسلم قومیں اسلام میں جب داخل ہوئیں تو وہ اپنے قدیم خیالات کو ساتھ لے کر آئیں۔ اور انہوں نے جب قرآن کریم کے مطالب بیان کرنا شروع کئے تو اپنے قدیم روایات، یونانی علم الاصنام اور فلسفہ کے مسلمات کے مطابق تفسیریں لکھنا شروع کر دیں۔

ایران و مصر کی فتح کے بعد بالخصوص بنو عباس کے عہد سے عرب کے مسلمانوں اور ان مفتوحہ اقوام کے افراد میں رابطہ شروع ہوا۔ ایرانی رفتہ رفتہ ترقی کرتے گئے اور بہت جلد وہ عربوں پر غالب آگئے اور حکومت کے ہر شعبے پر چھا گئے۔ بنو امیہ کے عہد تک اسلامی تعلیمات پر بیرونی اثرات کم رہے لیکن اس عہد میں ایک بڑی خرابی یہ رہی کہ عربی اور عجمی قومیت کی تفریق اور عجمیت پر عربیت کو فوقیت دینے کی بڑی کوشش کی گئی حالانکہ اسلام نہ صرف عرب کے لئے بلکہ تمام دنیا کے لئے آیا تھا یہ ناممکن تھا کہ عرب کی قوم ہمیشہ دوسرے ممالک پر غالب رہتی صرف اس لئے کہ اسلام کا ظہور وہیں ہوا تھا۔ بالخصوص جبکہ ان کی سیرت اور ان کی جماعت خود غیر اسلامی سیاست اختیار کر چکی تھی اس رقابت کا نتیجہ یہ ہوا کہ عجمیوں نے عرب کی ہر چیز کو ذلیل کرنا اور ایرانی تمدن کو بڑھانے کی ہر امکانی جد و جہد شروع کر دی۔ حتیٰ کہ اسلامی عقائد کو بھی عجمی اور یونانی رنگ میں رنگنا شروع کر دیا۔ بدقسمتی سے یہودیوں کی بڑی جماعت اسلام میں منافقانہ حیثیت

سے صرف اسی لئے داخل ہوئی کہ وہ اسلام کو صیہونیت کی تعلیمات سے متاثر کریں۔ انہوں نے سینکڑوں ہزاروں غلط احادیث وضع کر کے رسول کے نام سے منسوب کر دیں اور ان کو افسانہ خوانوں اور واضعین احادیث کے ذریعہ کافی مشہور کر دیا۔ جس قدر خرافات اور اسرائیلیات ان کے اندر جاری تھیں انہوں نے تبدیلی الفاظ کے ساتھ سب کو اسلامی سوسائٹی میں رائج کر دیا۔ یوم الحساب، حشر اجساد، سحر، معراج، معجزات حضرت یوسف، اور حضرت سلیمان سے متعلق جس قدر اسرائیلیات یہود کاہنوں اور عیسائی رہبانوں میں جاری تھیں۔ وہ سب اسلام میں داخل ہو گئیں۔ اس عہد میں تدوین احادیث کا جوش اس قدر غالب تھا کہ ایک ایک حدیث رسول کو سننے اور تصدیق کرنے کی غرض سے ہزاروں میل کا سفر گوارا کیا جاتا تھا۔ ان غلط روایات کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب قرآن کریم کی تفسیر کا رواج شروع ہوا اور آیات کے شانِ نزول وغیرہ کی روایات تفسیروں میں شامل کی گئیں اور ان کے مطالب کی مزید تشریحات ان روایات کی روشنی میں کی گئیں تو قرآن کریم کے مطالب کی حقیقت ان روایات میں مستور و محجوب ہو کر رہ گئی۔ پھر جب فلسفے کا دورہ شروع ہوا اور یونانی ہندی اور ایرانی کتب کے تراجم عربی زبان میں کئے گئے تو آیات قرآنی کے مطالب بھی یونانی نظریات کے مطابق بیان کئے جانے لگے۔ افلاطون، ارسطو اور سقراط کے فلسفیانہ نظریات کو مسلمہ حقیقت و صداقت سمجھ کر وحی الٰہی کی تفسیریں انہی کے مطابق کی جانے لگیں۔ تجسم و گردش آسمان، مسئلہ روح، فنا و بقا کی بحثیں، مسائل جبر و قدر اور بہت سے اس قسم کے مسائل جن کو قرآن کریم میں آیات متشابہات کے نام سے موسوم کیا گیا ہے اور جن کی تفصیلات قصداً نظر انداز کر دی گئی تھیں تاکہ انسان لفظی بحثوں میں الجھ کر عمل کی دنیا سے الگ نہ ہو جائے جب ان فلسفی مفسرین کے سامنے آئے تو انہوں نے یونانی نظریات کی روشنی میں ان سب کے

مطالب بیان کرنا شروع کئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن کریم کی آیات کے متعلق بیشمار بحثوں کے دروازے کھل گئے۔ ان سب سے زیادہ غضب یہ ہوا کہ قرآن کریم کی آیات کو مسلمانوں نے اپنے مادی اغراض، بیماریوں، آسیب اور سحر کو دور کرنے کیلئے منتروں اور تعویذوں میں استعمال کرنا شروع کردیا۔ قرآن کریم کے معانی سے زیادہ اسکے عربی الفاظ پر زور دیا جانے لگا۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ قرأت الفاظ قرآنی کو محض ثواب کی خاطر پڑھا جانے لگا اور مطالب سے یکسر غفلت برتی جانے لگی۔

موضوع احادیث اور عجمی نظریات پر تفسیروں کی بنیاد رکھنے والے علماء کی ان کمزوریوں کے باوجود اس حقیقت کا چھپانا جرم ہے کہ مفسرین اور محدثین کی جماعت نے مسلمانوں کی توجہ کو ہمیشہ علوم اسلامی کی طرف مبذول رکھا۔ علوم قرآن و احادیث کو اپنی تصنیف و تالیف اور درس و تدریس کے ذریعے انہوں نے ہمیشہ زندہ رکھنے کی کوشش کی اور ان کی اشاعت کے لئے انہوں نے اپنے آپ کو ہمیشہ وقف رکھا۔ ہر چند ان کی نادان دوستی سے اسلام کو نقصان بھی پہنچا لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ ان کے مقاصد بلند اور ان کا نصب العین خدمت اسلام تھا۔ یہ صحیح ہے کہ ان کی جزئیات پرستی، سطحی موشگافیوں اور بحثوں کی وجہ سے عام مسلمانوں میں انتشار اور افتراق کے دروازے کھل گئے لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ انہی علماء کی کوششوں اور علوم اسلامی کی اشاعت میں ان کی مسلسل جدوجہد نے افکار انسانی کو آزاد کرانے میں بڑی مدد کی۔ آج یورپ میں جس قدر علمی روشنی موجود ہے وہ نظر نہ آتی اگر اسپین اور مصر اور دوسرے ممالک کے علماء و حکماء اسلام علوم اسلامی کی اشاعت کو اپنا نصب العین نہ بناتے۔ علماء اسلام کا سب سے بڑا کارنامہ فقہ کی تدوین ہے۔ جس طرح ان علماء نے اسلامی قوانین کو مرتب کیا اور تمام اطراف ممالک میں فقہی علوم اسلامی (Jurisprudence) کو پھیلایا اور عدالتوں کا نظام قائم کیا اس کی مثال اسلام سے قبل کہیں نہیں۔ بدقسمتی سے نظام ملوکیت نے اسلام

کے بڑھتے ہوئے قانونی سسٹم کو بہت نقصان پہنچایا اور اس کی آزادی اور وسعت پہ ایک شدید ضرب لگائی لیکن پھر بھی جس قدر وسعت، تنظیم و انضباط اور آزادی اسلامی جوڈیشل سسٹم میں موجود ہے وہ کسی اور موجودہ یا قدیم حکومت میں نہیں ملتی فقہ اسلامی کی بنیاد قرآن، سنت رسول اور اجتہاد پر ہے جن احکام کو قرآن کریم میں بیان کر دیا گیا ہے یا جن مسلمہ احادیث سے کوئی حکم مستنبط ہوتا ہے وہ اسلامی قانون کا درجہ رکھتے ہیں لیکن ایسی احادیث کی تعداد جو سب کے نزدیک مسلّم ہوں بہت کم ہیں۔ ابن خلدون اور بعض دوسرے مورخین کے نزدیک امام ابوحنیفہ نے صرف سترہ احادیث کو جو آپ تک پہونچیں صحیح تسلیم کیا ہے جن سے احکام کا استنباط کیا جا سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ امام مالک، امام حنبل اور امام شافعی کے برخلاف امام ابوحنیفہ کے مستنبط کئے ہوئے قوانین کی بنیاد زیادہ تر رائے اور اجتہاد پر ہے اس لئے علماء عراق کو اہل الرائے کے نام سے موسوم کیا گیا ہے فقہ کے جزوی مسائل میں شروع ہی سے علماء اسلام میں رائے کا کافی اختلاف رہا ہے۔ لیکن چوتھی صدی ہجری تک ان اختلافات کی بنا پر کبھی کوئی نیا مذہب فقہ قائم نہیں ہوا۔ عوام آزاد تھے کہ مسائل کی تحقیق میں جس عالم کے مسلک کو چاہتے اختیار کر لیتے کوئی فرقہ بندی یا اس کی بنا پر کہیں تعصب کا نام و نشان تک نہ تھا لیکن جب چوتھی صدی ہجری میں مسلم سیاست میں زوال شروع ہوا اور خلفاء نے جہاد اور علماء نے اجتہاد کرنا چھوڑ دیا اور علمی تحقیق کے دروازے بند ہوگئے تو فقہ میں بھی تقلید کا دور شروع ہوگیا اب عالم خواہ کتنا ہی قانونی ماہر ہوتا لیکن ائمہ اربعہ کی تقلید سے باہر نہ جا سکتا تھا۔ جو تحقیق پہلی صدی ہجری میں ہو چکی تھی اس سے آگے جانا جرم ہوگیا۔ رفتہ رفتہ چاروں ائمہ کے مقلدین نے چار مذاہب فقہ

قائم کرتے اور بہت جلد باہمی تعصب اس حد تک بڑھ گیا کہ ایک فرقے کے لوگ دوسرے فرقے کے امام کے پیچھے نماز تک نہ پڑھتے جس فرقے کو حکومت کی سرپرستی حاصل ہو جاتی وہ دوسرے مذہب کے علما کی آواز بند کرنے اور ان کے اثرات کو کم کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتا۔ مناظروں کی مجالس قائم ہونے لگیں اور معمولی معمولی مسائل کے اختلاف کی بنا پر اکھاڑے بننے لگے حتیٰ کہ باہمی رزم آرائی اور خونریزی تک نوبت آنے لگتی۔

فلسفہ بالکل یہی حال فلسفہ کے متعلق ہوا۔ ابتداء اسلام میں فلسفہ و حکمت یونانی کا کوئی رواج نہ تھا۔ علماء کی توجہ زیادہ تر قرآن و حدیث اور فقہ کی اشاعت میں مرکوز رہتی تھی۔ پہلی صدی ہجری میں صرف ایک مسئلہ جبر و قدر کے متعلق فلسفیانہ بحث و مناظرے کی مثال ملتی ہے۔ ذات و صفات الٰہی اور مومن فاسق و منافق کی حیثیتوں پر بھی بحثوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا لیکن اس قسم کے جزوی مسائل کی تحقیق و تدقیق دوسری صدی ہجری سے شروع ہوئی۔ مامون الرشید کا عہد فلسفے کی ترقی کے شباب کا زمانہ تھا اس کے عہد میں خلق و قدیم قرآن کے مسئلہ پر علماء معتزلہ اور دوسرے علماء میں بحث و مناظرے کی گرم بازاری نے اس حد تک زور پکڑا کہ ہزاروں مسلمان عالم اور فقیہ مامون کے حکم سے صرف اس لئے قتل کئے گئے کہ وہ قرآن کریم کو قدیم مانتے تھے جو ان کے نزدیک شرک اور ارتداد کے مرادف تھا اور مرتد کی سزا سوائے قتل کے اس عہد میں اور کچھ نہ تھی اس کے بعد یہ سلسلہ برابر قائم رہا اور فلسفہ کی بناء پر بے شمار فرقے اسلام میں پیدا ہو گئے جن کا کام صرف یہ تھا کہ معمولی معمولی مسائل غیر ضروری کی بنا پر باہمی رزم آرائیوں میں مصروف رہتے۔ چھٹی ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری میں فلسفیانہ مجالس ہر وزیر امیر اور سلطان کے درباروں میں منعقد ہوتی تھیں۔

حنبلیوں۔ اشعریوں۔ معتزلیوں اور اشعریوں اور کبھی شیعہ سنیوں میں اس قسم کے مسائل پر بحث و تکرار کے بازار گرم رہتے کہ خدا کی پشت کس طرف ہے۔ روح اور مادہ میں کیا فرق ہے؟۔ انسان میں الٰہی صفات کس طرح آسکتی ہیں؟ آسمان و زمین کی کیا حقیقت ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

لیکی اہل روم کے انحطاط کے سلسلے میں لکھتا ہے:۔

"معلوم ہوتا تھا ترقیٔ علم و کمال کے دن ختم ہو چکے ہیں اور ایک صرف اسلاف پرستی و استخواں فروشی کا مشغلہ باقی رہ گیا ہے۔ علماء کا کام یہ تھا کہ قدیم کتابوں کے شرح و حواشی لکھا کریں۔ قوتِ اجتہاد معدوم ہو گئی تھی کوئی نیا مسئلہ پیدا کرنا سخت معیوب سمجھا جاتا تھا قدامت پرستی و جمود ہر شے پر طاری تھا گفتگو میں بڑے بڑے مغلق و متروک الفاظ ٹھونس دینا علم و فضل کی دلیل سمجھی جاتی تھی نصاب تعلیم میں سارا زور صرف و نحو اور منطق پر تھا۔ صرف و نحو کے مسائل پر بڑی معرکۃ الآرا بحثیں ہوتیں اور منطقی معمول کا حل کرنا مقصود زندگی سمجھا جاتا۔ شام کے وقت ٹارس کی میز پر جب اس کے تلامذہ تفریح و تفنن کی غرض سے جمع ہوتے تو ہمیشہ اس طرح کے مباحث چھڑ جاتے:۔

"انسان کو مردہ ٹھیک کس وقت کہنا چاہیئے؟ آیا اس کی زندگی کے آخری لمحے پر یا اس کی موت کی اولین ساعت پر؟

یہ ٹھیک کس وقت کہنا چاہیئے کہ آدمی کھڑا ہو گیا؟ آیا اس کے چارپائی چھوڑنے کے آخری وقت یا اس کے کھڑے ہو جانے کی پہلی گھڑی پر؟۔

اخلاق کی جانب بے شبہ انہیں دل سے توجہ تھی۔ لیکن یہاں بھی کٹھ حجتی اور قدامت پرستی دامن نہیں چھوڑتی تھی کوئی مسئلہ ہو جب تک قدما کے یہاں اس کی ملت و

حرمت، جواز و عدم جواز پر نص صریح نہ مل جائے گی۔ یہ ایک قدم آگے نہ بڑھائیں گے؟ ۱؎

اقوام کے ارتقاء و انحطاط کے اصول کس طرح باہمی مماثلت اور مشابہت رکھتے ہیں اس کا پورا ثبوت لیکی کے مندرجہ بالا بیان میں موجود ہے جو بالکل اسی طرح مسلم سوسائٹی کے انحطاط کے وقت کا مکمل مرقع ہے جس طرح اہل روما کی علماء و فقہا کے جمود اور قدامت پرستی۔ اختلاف رائے رکھنے والے علماء پر ان کے تشدد اور استبداد کی مثالیں اور اختلاف عقائد کی بناپر ارتداد و الحاد کے جرم میں قتل و خون سولی دیئے اور گردن کاٹنے کے جس قسم کے واقعات خلافت کے آخری دور میں ملتے ہیں تقریباً ہر قوم کی مذہبی اور اخلاقی انحطاط کی تاریخ میں اس قسم کے حالات ملتے ہیں۔ ہندوستان، مصر اور روم کے مذہبی پیشواؤں کے مظالم سے تاریخ کے صفحات پر ہیں۔ فرق اس قدر ہے کہ ان قدیم اقوام کے علماء جو کچھ مظالم کرتے تھے وہ دوسرے مذاہب والوں پر مثلاً رومی پیشوا۔ عیسائیوں پر اور ہندوستانی پنڈت اچھوتوں وغیرہ پر لیکن مسلم علماء کا استبداد اپنے ہم مذہب افراد تک محدود تھا۔ اس عہد کی تاریخ کے ہر دور میں غیر مسلم نہایت آزادی کے ساتھ اپنے عقائد کی اشاعت کرتے تھے مگر خود مسلمان جزوی عقائد کی بناپر سخت عذاب میں مبتلا کئے جاتے تھے۔ پھر بھی ان عقوبتوں کی شدت رومی علماء کی سختیوں کے مقابلہ میں بالکل ہیچ ہیں۔ رومیوں کی سختیوں کا تو یہ عالم تھا کہ:-

"مسیحی لوہے کی سرخ انگارہ کرسیوں پر بٹھائے جاتے تھے اور ان کے بٹنے

۱؎ تاریخ اخلاق یورپ جلد اول ص ۳۲۶

ہوئے گوشت سے دھواں اٹھتا تھا۔ ان کا گوشت لوہے کے کانٹوں کی مدد سے ان کی ہڈیوں سے کھرچا جاتا تھا۔ دھیمی دھیمی آگ میں وہ گھنٹوں اسی طرح بھونے جاتے تھے کہ اس عذاب کے مقابلے میں کبا رگی ان کو قتل کر ڈالنا ان پر رحم کرنا تھا ایک ایک عضو دوسرے سے کاٹ کر الگ کیا جاتا تھا اور اس میں جلتا ہوا سیسہ پلا دیا جاتا تھا۔ ان زخموں پر نمک اور سرکہ ڈالا جاتا تھا یہ عذاب سارے سارے دن رکھے جاتے۔ اور ایک مرتبہ تو یہاں تک ہوا کہ ۲۲۵ آدمی اس حالت میں باہر نکالے گئے کہ ان میں سے ہر شخص کی ایک ایک آنکھ اپنے حلقہ سے باہر نکال لی گئی ہے اور ایک ایک پیر سے ایک ایک گوشت کا لوتھڑا سرخ انگارہ لوہے سے کاٹ لیا گیا ہے [۱]

عیسائی پادریوں اور بخصوص رومن کیتھولک پادریوں اور بادشاہوں نے جو کچھ اپنے مخالفین کے ساتھ کیا اور جس طرح بے گناہ افراد کو سائنس کی تحقیقات کے جرم اور اختلاف عقائد کی بنا پر زندہ آگ میں جلایا اور مختلف طریقوں سے پریشان کیا اس کے بیان کرنے کیلئے ایک دفتر کی ضرورت ہے۔

تصوف ملوکیت اور ملائیت کا باہمی تعاون اور تعلق اس دور کی خصوصیات ہیں شہنشاہیت کے غلط اور غیر اسلامی نظام اور سلاطین و خلفاء کے استبداد و آمریت کو علماء و فقہاء کی طرف سے بالعموم پوری مدد ملتی ہے۔ احکام سلطانی کا نفاذ علماء کی سند جواز کے ساتھ ہوتا اور فقہا کے فتووں کی محافظ شہنشاہی تلوار

[۱] تاریخ اخلاق یورپ جلد اول ص ۲۹۱

تھی۔ مسلم عوام بلکہ اصحاب عزیمت و علمار حق تک کی گردنیں اس دوہری غلامی کی زنجیروں سے اس طرح بندھ چکی تھیں کہ اس سے باہر نکلنے کا تخیل تک گناہ بن چکا تھا جس حکومت میں علمار اور سلاطین کے متحدہ احکام سے سرتابی کا نام خدا سے بغاوت ہو وہاں سر اٹھانے اور شکوہ کرنے کی مجال کس کو ہو سکتی تھی؟ علمار حق کی نحیف اور کمزور آوازیں اس متحدہ طاقت کے سامنے دب کر رہ جاتی تھیں اس استبداد کا زبردست نقصان یہ ہوا کہ ان حق پسند اور خدا پرست افراد کی ایک زبردست جماعت جو اپنے اندر نہ ملوکیت کے مقابلے کی طاقت رکھتی تھی نہ اس نظام کی معاون بننا چاہتی تھی جو علمار سوء کے نفاق انگیز اور افتراق آفریں طرز عمل سے متنفر اور امت کی باہمی رزم و معرکہ آرائی اور خانہ جنگی سے سخت نالاں تھی مایوس ہو کر زاویہ نشین بن بیٹھی۔ مسلم سوسائٹی میں یونانی خانقاہیت اور ہندی رہبانیت کے اثرات دوسری تیسری صدی ہجری میں داخل ہو چکے تھے اور ترک لذائذ و علائق دنیوی گناہوں کا عام کفارہ اور علاج سمجھا جانے لگا تھا۔ پیری مریدی اور تزکیہ اخلاق و پاکی نفس کے لئے بیعت کا سلسلہ قائم ہو چکا تھا مردان حق کی گوشہ نشینی اور رہبانیت نے جو منجملہ اور اسباب کے ملوکیت کے ردّ عمل کے طور سے وجود میں آئی۔ نظام خانقاہیت کی بالکل ہی تکمیل کر دی اسلامی ممالک کے ہر حصے میں خانقاہیں قائم ہو گئیں زاویے اور تکیے بن گئے جن میں ہزاروں، لاکھوں مسلمان خانقاہ نشین بزرگوں سے دعائیں اور برکتیں حاصل کرنے، مسائل سلوک و تصوف پر درس لینے تزکیہ قلب اور اصلاح نفس کی غرض سے بیعت کرنے جوق در جوق آتے بیعت کرتے وقت مرید اس بات کا اقرار کرتا کہ وہ خود کو پیر کے حوالے کرتا ہے اور اس کے ہر حکم کی اطاعت اس کا عین ایمان ہے۔ اس طرح بیعت امیر کے ساتھ ساتھ پیروں کی

بیعت کا سلسلہ باضابطہ طور سے قائم ہوگیا۔ بیعت کا طریقہ ابتدائے اسلام میں موجود تھا لیکن اسوقت پیری مریدی کا رشتہ محض درس وتدریس تک محدود ہوتا تھا پیر کی "مکمل اطاعت" کا کوئی نظام اسوقت نہ تھا۔ لیکن اب نہ صرف بیعت کا نظام باقاعدہ شروع ہوا بلکہ مذاہب فقہ کی طرح بزرگانِ دین کے سلسلے بھی مقرر ہو گئے اور تصوف، سہروردیہ، چشتیہ، قادریہ جیسے خاندانوں اور سلسلوں میں تقسیم ہوگیا۔ اکثر مرید پیر کی اطاعت کو بادشاہ کی اطاعت پر مقدم جانتے تھے۔ خانقاہوں میں عقیدتمندوں کے ہجوم کا یہ عالم ہوتا تھا کہ بادشاہوں کے درباروں کی سطوت بھی ان کے سامنے ماند پڑنے لگی تھی۔ ابتداء میں تصوّف کا یہ نظام ملوکیت کے لئے ایک خطرہ نظر آنے لگا۔ ایک سلطان یا خلیفہ یہ کب گوارا کر سکتا تھا کہ اس کی مملکت کی حدود میں کوئی دوسرا فرد عوام پر حکومت کر سکے۔ علماء سوء نے ان خطرات کو اور بڑھا چڑھا کر پیش کیا چونکہ شاہی درباروں سے بے اعتنائی، پرہیز اور استغناء ابتدائی عہد تصوّف کے خصوصیات تھے اس لئے درباریوں نے سلاطین کو اور بھڑکایا کہ ان کی حکومت کے ساتھ ساتھ خانقاہی حکومت کا ایسا متوازی نظام قائم ہو رہا ہے جو بہت جلد ملوکیت کے نظام کو درہم برہم کر دیگا۔ اس خطرے کو دور کرنے کے دو ہی طریقے تھے یا تو خانقاہوں پر قبضہ کر کے علماء سوء کی طرح صوفیوں کو بھی ملوکیت کے دام میں اسیر کیا جاتا یا ان کو بالکل ختم کر دیا جاتا۔ جو خانقاہیں محض فریب نفس زر اندوزی اور جاہ طلبی کے لئے قائم ہوئی تھیں وہ دام ملوکیت میں بہت جلد آگئیں لیکن جن بزرگانِ دین نے فرمانروائے وقت کی اطاعت اور ان کی طاقت کے سامنے

سر جھکانے سے انکار کیا ملوکیت کی پوری مشین ان کے خلاف حرکت میں آجاتی صوفیاء کرام کو گرفتار کر کے محکمہ احتساب عقاید کی طرف سے عدالت میں ان پر الحاد و زندقہ کے الزامات لگائے جاتے ان کی گردنیں ماری جاتیں سولی چڑھائی جاتی ان کو جلاوطن کیا جاتا غرضیکہ ان کی طاقت ختم کرنے کے لئے ہر حربہ استعمال کیا جاتا۔ ان صوفیاء میں بہت سے ایسے بھی تھے جو اگرچہ زر طلب اور جاہ پسند نہ تھے لیکن عقائد کی گمراہی کی وجہ سے جنون آمیز اور فتنہ انگیز حرکات کرتے تھے اور عوام کی بڑی بڑی جماعتیں ان سے عقیدت رکھنے کی وجہ سے ان کے ساتھ ہوتی تھیں۔ ان کا صحیح مقام جنون خانہ یا جیل ہو سکتی تھی لیکن کفر کے فتووں اور جلاد کی تلواروں سے ان کو بھی پناہ نہ مل سکتی تھی۔ ملوکیت کے خلاف جنگ بالعموم بزرگانِ دین کی حیات ہی تک محدود رہتی تھی۔ ان کے بعد ان کے جانشینوں میں نہ وہ صلاحیتیں تھیں نہ وہ روحانی طاقت جس سے وہ سلاطین کا مقابلہ کر پاتے سلطنت کی طرف سے ان کے جانشینوں کے وظائف مقرر کر دیئے جاتے خانقاہوں کے اخراجات کے لئے بڑی بڑی جائدادیں وقف کر دی جاتیں بزرگوں کے بلند مقبرے تعمیر کرا دیئے جاتے اور خانقاہ نشین مریدوں کے لئے لنگر خانے جاری کئے جاتے ان انعامات و عطیات کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ وہی خانقاہیں جن سے کبھی بغاوت کا خطرہ تھا اب شاہی اطاعت و وفاداری کے مرکز بن گئے جہاں سے سلاطین کی درازیٔ عمر اور بقاء سلطنت کی دعائیں مانگی جاتی تھیں اہلِ تصوف دنیوی معاملات اور سیاسیات سے یکسر علیحدہ رہنے لگے اور معاملات خسروی میں مداخلت اور حکومت کے استبداد اور تشدد پر تنقید کرنا معیوب سمجھا جانے لگا۔ حافظ شیرازی نے اس دور کی اس خصوصیت کو نہایت بلیغ الفاظ میں اس

طرح ادا کیا ہے ؎

گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش
امور سلطنت خویش خسرواں دانند

صوفیاء کی یہ گوشہ نشینی نظام ملوکیت کے قیام میں بے حد معاون ہوتی کیونکہ اب صوفی اور علماء دونوں گروہ سلطنت کے دوست اور مددگار تھے اس لئے تنقید اور احتجاج کرنے والی کوئی منظم جماعت باقی نہ رہی تھی۔ خانقاہیں رفتہ رفتہ مجاوروں اور سجادہ نشینوں کی تفریح گاہیں بن گئیں۔ مزارات پر سالانہ عرس کے جشن اور میلے لگنے لگے جہاں عوام عقیدت کی نذریں لے کر آتے اور سجادہ نشینوں کی آسائشوں اور عیش سامانیوں کے لئے دولت فراہم کرتے ہیں۔ علامہ اقبال رح نے ان خانقاہ نشینوں کے متعلق بالکل صحیح فرمایا ہے ؎

خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن
قم باذن اللہ کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے

خانقاہوں میں ہندی جوگیوں اور یونانی اور عیسائی راہبوں کے طرز پر غیر فطری حدود و قیود کے ساتھ زندگی گزارنے اور زہد خشک و عزلت نشینی اختیار کرنے اور نفسی خواہشات اور انسانی ضروریات کو ترک کرنے کا ردعمل فوراً شروع ہوا گانا بجانا اور رقص و سرود عبادت کے اجزا ہو گئے عشق مجازی عشق حقیقی تک پہنچنے کا ذریعہ بن گیا اور امرد پرستی کو خدا پرستی کا زینہ سمجھ لیا گیا یا توحید پرستی کا یہ عالم تھا کہ ذات پہ صفات کا وزن بھی گراں معلوم ہوتا تھا اور لا اللہ کے پہلے لفظ لا سے "توحید شرک آمیز" کا شبہ ہوتا تھا جیسا کہ نظیری نے کہا ہے ؎

کو عشق تا بکوبم شرع خلاف انگیز را ؟
چند از موذن بشنوم توحید شرک آمیز را ؟

یا مزارات پر تعظیمی سجدے شروع ہو گئے اور پیروں کو صفات الوہیت سے

منصف کیا جانے لگا۔

انحطاط کے اثرات

ان تمام اسباب نے مل کر پوری مسلم سوسائٹی کو مفلوج کر دیا خانہ جنگیاں اور باہمی رزم آرائیاں عام ہو گئیں علم و حکمت اور اجتہاد و تحقیق کی جگہ جہالت، توہمات اور تقلید کو راہ نے لے لی۔ عمل اور جد و جہد، تجارت اور کسب معاش اور اکتساب ہنر کا نام "دنیا" اور بے عملی، عزلت نشینی، اپاہجی اور بے کاری کو عین "دین" تصور کیا جانے لگا۔ سکون و عافیت نصب العین بن گیا۔ غرضیکہ پوری قوم پر نسوانیت چھا گئی اس کا فطری نتیجہ جو ہونا چاہیئے تھا ظاہر ہوا اور پوری اسلامی دنیا کی سیاسی طاقت عیسائیوں اور مغلوں کے طوفان کے سامنے خس و خاشاک کی طرح بہ گئی۔ بغداد۔ قرطبہ اور غرناطہ کے افسانے باقی رہ گئے نہ وہ تمدن باقی رہا نہ علمی کارنامے اور نہ وہ شکوہ ملک ہیبت قوم ع

آں قدح بشکست و آں ساقی نہ ماند

خلافت راشدہ کے بعد اسلامی سیاست اور نظام حکومت کا زوال تاریخ کا بڑا سانحہ تھا۔ اگر حضرت علی رض کے بعد اسلام میں امپیریلزم راہ نہ پالیتی تو آج دنیا نہ معلوم ترقی کی کس منزل تک پہنچ جاتی لیکن ایسا ہونا بالکل فطری اور قرین قیاس تھا کیونکہ اس وقت تک عام انسان اتنی تربیت نہ پا سکا تھا اور نہ انسانی فکر نے اتنی ترقی کی تھی کہ وہ اسلامی نظام کی تمام پیچیدگیوں اور ذمہ داریوں کا بار اٹھا سکتا۔ خلافت راشدہ کے بعد جہاں کہیں مسلم حکومت قائم ہوئی وہ مسلمانوں کی قومی حکومت تھی جس کی بنا نسل خاندان اور مسلم قومیت پر تھی نہ کہ اسلام کے سیاسی اصولوں پر۔ اس قومی حکومت کا کیرکٹر خالص ملوکیت پر تھا جس کی سنت صاف اور واضح

الفاظ میں کی جا چکی ہے ملوکیت کی تقریباً ہر شکل اور اس کے پیدا کردہ تمام نتائج پر پوری غیر جانبداری اور رواداری کے ساتھ تنقید ... شدید مفصل طور سے اصل کتاب میں کی گئی ہے۔ اور یہ بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ مسلمان بادشاہ نظام ملوکیت کو پروان چڑھانے اور شاہانہ شان و سطوت میں کسی قوم سے پیچھے نہیں رہے سوائے اس کے کہ کبھی کسی بادشاہ کو صفات الوہیت سے متصف نہیں کیا گیا لیکن ملوکیت کے علاوہ انسانی زندگی کے ہر اس پہلو میں اور حکومت کے ہر اس شعبے میں جہاں تاج و تخت سلطانی پر کوئی ضرب نہیں پڑتی تھی مسلمانوں کے کارنامے دوسری اقوام اور آئندہ نسلوں کے لئے ہمیشہ مشعل راہ کا کام دیتے رہیں گے۔ کوئی قوم ان کے سیاسی، تمدنی اور معاشرتی کارناموں کا مقابلہ نہیں کر سکتی، عوام کی خوشحالی تمدن کی ترقی، مذہبی آزادی اور علم و حکمت کی تحقیق میں انھوں نے جس رواداری کا ثبوت دیا ہے اس کی مثال ابتک تاریخ پیش نہیں کر سکتی

مسلمانوں کے علمی اور تمدنی کارنامے

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے اور جس کی کافی تفصیل کتاب میں دے دی گئی ہے مسلمانوں نے یونانی، ایرانی اور ہندی خیالات اور تمدنوں سے کافی اثرات قبول کئے اور ان قدیم علوم کو جو مردہ ہو چلے تھے عربی تراجم اور حواشی کے ذریعے از سر نو زندہ کیا اس سے خالص علوم اسلامی کو کافی نقصان اٹھانا پڑا۔ لیکن ان اقوام اور ممالک میں مسلمانوں نے اپنی تہذیب اور کلچر کو جس سرعت کے ساتھ پھیلایا وہ بذات خود حیرت انگیز ہے۔ مسلمانوں نے عربی عجمی اور رومی تہذیب سے ایک متحدہ کلچر کی بنیاد ڈالی جو بہت جلد تمام دنیا پر چھا گیا۔ بت پرستی اور

ادہام پرستی کے اس دور میں مسلمانوں نے ہر جگہ توحید کی روشنی پہنچائی مشہور فرانسیسی مؤرخ لیبان اس سلسلے میں اپنی کتاب "تمدن عرب" میں لکھتا ہے :-

"جس نتیجے کو نہ یونانی نہ ایرانی نہ رومی مشرق میں حاصل کر سکتے تھے وہ عربوں نے نہایت سرعت کے ساتھ اور بلا جبر حاصل کر لیا۔

ظاہراً مصر وہ ملک معلوم ہوتا تھا جس میں ایک غیر قوم کے خیالات کا قائم ہو جانا نہایت دشوار تھا۔ تاہم عمرو کی فتح سے ایک صدی کے اندر یہی مصر اپنے سات ہزار برس کے تمدن کو بھول گیا اور اس نے ایک نیا مذہب اور ایک نئی زبان اور ایک نئی صنعت اس استحکام کے ساتھ اختیار کر لی کہ یہ چیزیں ان ملک گیروں کے بعد بھی جنہوں نے ان کو جاری کیا قائم اور سلامت ہیں۔

عربوں نے مصریوں سے پہلے ایک ہی مرتبہ اپنے مذہب کو بدلا تھا اور وہ اس زمانے میں جبکہ قسطنطنیہ کے شہنشاہوں نے ملک میں غارت گری برپا کی تھی اور تمام پرانی یادگاروں کو برباد اور منہدم کرا دیا تھا اور پرانے مصری معبودوں کی پرستش کو جرم ٹھہرا دیا تھا جس کی سزا موت تھی مصریوں نے اس مذہب کو جو اس قدر جبر کے ساتھ شائع کیا جاتا تھا منظور تو کر لیا مگر قبول نہیں کیا تھا اور جس سرعت کے ساتھ انہوں نے عیسائی مذہب کو چھوڑ کر اسلام قبول کیا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس جابرانہ مذہب کا تسلط ان کے قلب پر

کس درجہ کمزور تھا۔ جو اثر عربوں نے مصر پر ڈالا وہی افریقہ، شام
و ایران وغیرہ ممالک مفتوحہ میں بھی پھیلایا۔ ان کا یہ تسلط نہ فقط
ہندوستان تک پہنچا جہاں سے وہ محض گزر گئے تھے بلکہ چین
تک بھی پھیل گیا جہاں صرف ان کے تجار کا گزر
ہوا تھا۔

تاریخ عالم میں کسی قوم کے تسلط کی اس سے زیادہ صاف اور صحیح مثال
موجود نہیں ہے کل ان اقوام نے جن سے عربوں کو کام پڑا خواہ وہ چند روز
کیلئے کیوں نہ ہو ان کے تمدن کو قبول کر لیا اور جب وہ صفحہ
روزگار پر سے گزر گئے تو خود انکے فاتحین ترک و مغل وغیرہ نے ان کے تمدن کو
اختیار کر لیا اور دنیا میں اسکی اشاعت کے حامی و سرپرست بن گئے کئی
صدی سے تمدن عرب مر چکا ہے لیکن اسوقت میں بحر اٹلانٹک سے لیکر
دریائے سندھ تک اور بحر متوسط سے لیکر ریگستان افریقہ تک ایک ہی
زبان جاری ہے۔ اور یہ زبان اور یہ مذہب پیغمبر اسلام کی زبان
اور مذہب ہے عربوں کا تسلط ممالک مشرقی میں محض مذہب اور زبان کی طرف
ہی تک محدود نہیں رہا بلکہ علوم ادب تک بھی پہنچا ان دائمی تعلقات کے
ذریعے سے جو ان کو ہندوستان اور چین سے تھے مسلمانوں نے ان ملکوں میں
ان معلومات علمی کی اشاعت کی جن کو بعد کے زمانے میں اہل یورپ چینیوں
اور ہندوؤں سے منسوب کرتے ہیں۔ چینیوں نے جو کچھ عربوں سے لیا
وہ اس سے بھی زیادہ ہے جو ہندوؤں نے ان سے

اخذ کیا۔" ؎۱

عصرِ حاضر کی علمی ترقیاں ہرگز اس منزل تک نہ پہنچ سکتی تھیں اگر اسپین کے راستے مسلم علوم یورپ تک نہ پہنچتے۔ بدقسمتی سے مسلمانوں اور عیسائیوں کی سیاسی کشمکش باہمی جنگ و جدال اور خونریزیوں کی وجہ سے یورپ میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اس قدر تعصب پھیلایا گیا کہ وہاں مسلمانوں کے تمام علمی کارناموں پر پردہ ڈالنے کی ہمیشہ کوشش کی گئی پھر بھی مؤرخین نے جب کبھی غیر جانبدار ہو کر اس طرف دیکھا وہ مسلمانوں کو اس احسان کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوئے جو انہوں نے یورپ پہ کیا ہے۔ لی بان اس سلسلے میں "تمدن عرب" میں لکھتا ہے:۔

> "عربوں نے جو اثر یورپ پر ڈالا اس کا اندازہ کرنے کے لئے ہمیں یورپ کی اس زمانے کی حالت دیکھنی چاہئیے جس وقت تمدن عرب یہاں پہلے آیا۔
>
> اگر ہم یورپ کی نویں اور دسویں صدی عیسوی کی حالت کو جس وقت مسلمانوں کا تمدن اندلس میں اعلٰے درجہ کی ترقی پہ تھا۔ دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ہمارے علمی مرکز وہ بڑے بڑے بے ڈھنگے قید خانے تھے جہاں امراء اپنی نیم وحشی حالت میں رہتے تھے۔ اور اس پر فخر کرتے تھے کہ انہیں لکھنا پڑھنا نہیں آتا۔ عیسائیوں میں سب سے زیادہ باعلم وہ بیلے چارے

؎۱ تمدن عرب از ڈاکٹر گستاؤلی بان مترجمہ اردو از سید علی بلگرامی ص۵۱۱ و ص۵۱۲

جاہل راہب تھے جو اپنے وقت کو خانقاہوں کے کتب خانوں
سے یونان و روم کی پرانی تصانیف کو نکال کر ان کو چھیلنے اور ان کی
چرمی ورقوں پر اپنی مہمل مذہبی تصانیف لکھنے میں صرف کرتے تھے۔
اہل یورپ کی وحشیانہ حالت ایک زمانہ دراز تک ایسی شدید رہی
کہ خود ان کو اس کا احساس نہ تھا البتہ گیارھویں صدی عیسوی
میں اور زیادہ تر بارھویں صدی میں کسی قدر علمی امنگیں پیدا ہونے
لگیں جس وقت چند روشن خیال اشخاص کو اس جہالت کے
کفن پھاڑنے کی ضرورت معلوم ہوئی تو انہوں نے عربوں کی
طرف جو اس زمانہ کے اساتذہ تھے رجوع کی۔ جیسا کہ بار بار کہا
جاتا ہے یورپ میں عربوں کے علوم جنگ صلیبی کے ذریعے نہیں
پھیلے بلکہ اندلس اور جزیرہ صقلیہ اور اطالیہ کے ذریعہ سے ۱۱۳۰ء
سے طلیطلہ رئیس الاساقفہ ریمانڈ کی سرپرستی میں ایک مدرسہ
مترجمین کا قائم ہوا اور اس نے تمام مشہور عربی تصانیف کا
لاطینی میں ترجمہ شروع کیا ان ترجموں نے غایت درجے کامیابی
حاصل کی۔ یورپ کی آنکھوں کے آگے اک نئی دنیا نظر آنے لگی
اور بارھویں، تیرھویں، چودھویں صدی تک انہوں نے اس ترجمے
کے سلسلے کو جاری رکھا۔ صرف عربوں کی بدولت نہ ان راہبوں
کی وجہ سے جو زبان یونانی کا نام بھی نہ جانتے تھے تصانیف قدیمہ
ہم تک پہنچی ہیں اور دنیا کو ہمیشہ ان کا ممنون رہنا چاہیئے کہ انہوں

نے ذخیرۂ بے بہا کو تلف ہونے سے بچایا۔ موسیو لی بری لکھتے ہیں
کہ اگر عربوں کا نام تاریخ سے نکال دیا جاتا تو یورپ علمی نشاۃ ثانیہ
کئی صدی تک پیچھے ہٹ جاتی۔

ان ہی عربوں کی ترجمہ کی ہوئی کتابوں پر پانچ صدی تک یورپ
کے دارالعلوموں کی تعلیم کا دارومدار رہا بعض علوم میں مثلاً طب میں
یہ کہا جا سکتا ہے کہ عربوں کا تسلّط خود ہمارے زمانہ تک رہا ہے
کیونکہ صدی گزشتہ کے اخیر تک فرانس میں ابن سینا کی تصنیفات
پر شروح لکھی جاتی تھیں علوم عربیہ کا تسلط یورپ کے دارالعلوموں
پر اس حد تک تھا کہ فلسفہ کے سے علم میں بھی جس میں عربوں نے
زیادہ ترقی نہیں کی تھی ان ہی کی تصانیف پر دارومدار تھا تیرھویں
صدی عیسوی کی ابتدا سے ہمارے دارالعلوموں میں ابن رشد ہی
کا فلسفہ رائج تھا ۱۴۷۳ء میں جس وقت لوئی یازدہم نے نصاب تعلیم
قرار دیا تو اس نے یہی حکم دیا کہ فلسفہ میں ابن رشد اور ارسطو کی تصانیف
پڑھائی جائیں۔" ؎

علم و حکمت کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں مسلم مفکرین نے نئی معلومات
نہ کی ہوں کاغذ، قطب نما اور بارود جیسی اہم ایجادات مسلمانوں کی معلوم کردہ ہیں
مشہور مؤرخ موسیو سیو دیو فرانسیسی اپنی کتاب "تاریخ عرب" میں
لکھتا ہے:۔

؎ تمدن عرب ص ۵۱۴، ص ۵۱۵

"عربوں نے کاغذ، قطب نما، بارود اور توپوں کو ایجاد کیا اور ان
کی اس ایجاد سے تمام دنیا کی سیاسی، ادبی اور فوجی حالت میں
کیسا انقلاب عظیم رونما ہوا بعض یورپین اہل قلم نے عربوں سے
ان چیزوں کے ایجاد کرنے کا شرف زبردستی چھین لیا ہے ان کے
بیان پر کوئی التفات نہ کرنا چاہیئے اصل یہ ہے کہ ان اشیاء کے
موجد عرب ہیں اور عربوں ہی نے یورپ کو ان کا استعمال
سکھایا ہے" ؎۱

اس سلسلے میں پروفیسر فلپ کے ھٹی اپنی کتاب "ہسٹری آف دی عربس"
میں لکھتا ہے:-

"یورپ پر اسلام کے جہاں اور بہت سے احسانات ہیں اس میں
سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ انہوں نے کاغذ ایجاد کیا بغیر کاغذ کے ٹائپ
کی چھپائی جس کی جرمنی میں پندرھویں صدی میں ایجاد ہوئی ناممکن
تھی اور بغیر کاغذ اور طباعت کے یورپ میں تعلیم اس قدر عام نہ
ہو سکتی تھی کاغذ کی ایجاد مراکش میں ہوئی اور وہاں سے بارھویں صدی
کے وسط میں اسپین پہنچی" ؎۲

علوم افلاک و نجوم، کیمیا، جغرافیہ اور تاریخ وغیرہ میں بھی مسلمانوں کی
تحقیقات سائنس کے جدید انکشافات کے باوجود آج تک قابل تقلید ہیں۔

؎۱ تاریخ عرب مترجمہ اُردو از مولوی عبدالغفار خانصاحب صفحہ ۴۷۵

؎۲ ہسٹری آف دی عربس صفحہ ۵۶۴

عہد مامونی میں مسلم علماء فلک نے سورج گہن اور چاند گہن کے وقوع اور ومدار ستاروں کے طلوع و غروب وغیرہ کا حساب لگایا اور ان سیاہ دھبوں کو دریافت کیا جو قرص آفتاب میں ہیں۔

پروفیسر فلپ ھٹی لکھتا ہے کہ "عہد مامونی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس کے علماء نجوم نے زمین کے قطر اور گولائی کی پیمائش کی یہ پیمائش دریائے فرات کے شمال میں سنجار کے میدانوں میں اور پالمیر کے قریب کی گئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ زمین کی گولائی بیس ہزار میل اور قطر چھ ہزار پانچ سو میل ہے۔ فلکیات اور جغرافیہ میں البوریحان البیرونی۔ عمر خیام اور نصیر الدین طوسی کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔"

علم تاریخ اور سیاست میں علامہ ابن خلدون (۱۳۳۲ء تا ۱۴۰۶ء) پہلا شخص ہے جس نے علم اجتماع اور طریقہ حکومت پر باقاعدہ بحث کی اور تاریخ کو فلسفے کی شکل میں پیش کیا۔ روسو کانٹ اور میکیاؤلی نے سوشلسٹ فلاسفی سے متعلق جن خیالات کو مدتوں بعد باضابطہ پیش کیا ابن خلدون نے آٹھویں صدی میں اسی موضوع پر لٹریچر کا کافی سامان بہم کردیا تھا جس کا اعتراف یورپ میں ہر جگہ کیا جا چکا ہے۔

اس عہد کے سائنس اور تمدن میں مسلمانوں کی برتری کا پتہ اس واقعہ سے چلتا ہے کہ شارل مین شہنشاہ فرانس کے سفیروں کو ہارون الرشید نے منجملہ اور تحائف کے ایک گھڑی ایسی بھیجی تھی جو وقت بتاتی تھی اور وقت پر گھنٹوں پر بجتی تھی۔ اس گھڑی کے متعلق لی بان لکھتا ہے:-

"اس گھڑی نے شارلیمین اور اس کے نیم وحشی مصاحبین کو جن کے ذریعے سے وہ بیچارہ بے فائدہ تمدن روم کی تجدید کی کوشش کر رہا تھا نہایت چکر میں ڈالا۔ اس کے دربار میں کوئی شخص بھی اس لائق نہ تھا جو اس گھڑی کے کھیل کا نٹے کو سمجھ سکتا۔" سلہ

اس عہد کی دنیا میں قرطبہ، دمشق، بغداد، قاہرہ یعنی صرف مسلم حکومتوں کے شہر ایسے تھے جہاں سڑکوں پہ پولیس اور روشنی کا باقاعدہ انتظام تھا۔ اس عہد میں سڑکوں، خطوط رسانی، مالگذاری، کاشتکاری، تعلیم عامہ، پولیس اور فوج کے جو شاندار انتظامات تھے وہ ویسے ہی تھے جو آج کل کسی بڑے سے بڑے ملک میں پائے جاتے ہیں۔ بغداد کے تمدن کی حالت بیان کرنے کے بعد لی بان لکھتا ہے:۔

"خلفاء کا پرانا دارالخلافت اسی گردِ روزگار میں جا ملا جس میں اس وقت تھیبس، بابل اور حمص پڑے سو رہے ہیں۔ ان دارالسلطنتوں نے بھی کسی زمانے میں دنیا پہ حکومت کی تھی لیکن ان کی حکومت محض فوجی حکومت تھی۔ برخلاف اس کے جو خلفاء بغداد پہ حکمران رہے انہوں نے اپنے تمدن کے ذریعے سے حکومت کی۔" سلہ

مسلمانوں کی تجارت کی وسعت کا یہ عالم تھا کہ دنیا کے ہر حصہ معلومہ میں بغداد، قاہرہ اور قرطبہ کی صنعت سے فائدہ اٹھایا جاتا تھا۔ عصر حاضر جیسا تجارتی مقابلہ اور محض تجارت کی خاطر پست اقوام کو غلام بنانے کا کوئی جذبہ اس زمانے میں موجود نہ تھا۔ غیر ملکی صنعت پہ آج کل کی طرح پابندیاں عائد نہ تھیں۔ فری ٹریڈ

سلہ تمدن عرب صہ ۱۶۸ سلہ تمدن عرب صہ ۱۶۷

اس عہد کی سب سے بڑی خصوصیت تھی۔ اس کے باوجود تمام دنیا میں صرف مسلم سوداگروں کا سکہ بیٹھا ہوا تھا۔ قاہرہ کی بندرگاہ میں وینس اور جینوا سے زیادہ جہازوں کی آمدورفت رہتی تھی۔ دریائے نیل پر چھتیس ۳۶ ہزار کشتیاں تجارتی مال کی درآمد برآمد میں رہتی تھیں۔ قرطبہ کے متعلق لی بان لکھتا ہے:۔

"دارالخلافت قرطبہ ایک ایسا مرکز علوم وفنون وحرفت وتجارت بن گیا تھا کہ اسے اس وقت کے بڑے بڑے یورپ کے دارالسلطنت کے مقابلے میں رکھ سکتے ہیں۔ یہ پرانا شہر اب بھی موجود ہے۔ لیکن موجودہ حالت میں تو اسے ایک مقبرہ کہنا چاہیئے۔ بہت کم مجھ پر ایسے دردناک خیالات کا ہجوم ہوا ہے جیسا اس وقت ہوا۔ جبکہ میں اس عظیم الشان ویرانے میں جہاں کسی وقت دس لاکھ آدمی تھے داخل ہوا اور جہاں ایک خاموشی کی حالت میں دیواروں ہی کے سائے میں پھرتے پھرتے گھنٹوں گذر جاتے تھے اس میں شک نہیں کہ عیسائیوں نے قرطبہ میں اسلامی ہلال کی جگہ پر صلیب کو قائم کرکے بڑی کامیابی حاصل کی مگر جس شہر پر ہلال کا سایہ تھا وہ دنیا کے شہروں میں بہت پررونق اور خوبصورت اور آباد شہر تھا برخلاف اس کے مسیحی صلیب آج کے دن اس اعلیٰ تمدن کو ویرانے پر سایہ فگن ہے جسے اس صلیب کے پوجنے والوں نے برباد کردیا مگر اس کی جگہ پر دوسرا تمدن نہ قائم کرسکے۔[۱]

---

[۱] تمدن عرب صد ۲۵۶

اسپین میں تعلیم عوام کے متعلق ڈاکٹر حتی لکھتا ہے:۔

"اور اسلامی ممالک کی طرح ابتدائی تعلیم قرآن صرف و نحو اور ادب پر مبنی تھی تعلیم اس قدر عام تھی کہ مسلمانوں کی بھاری اکثریت لکھنا پڑھنا خوب جانتی تھی جو اس عہد کے یورپ میں بالکل نئی بات تھی۔

اعلیٰ تعلیم میں دینیات قرآنی احکام، فلسفہ، صرف و نحو، تاریخ، جغرافیہ پڑھائے جاتے تھے بہت سے بڑے بڑے شہروں میں یونیورسٹیاں قائم تھیں۔ قرطبہ کی یونیورسٹی میں علم نجوم ریاضی اور علم کیمیا (ادویہ) بھی علاوہ قانون اور دینیات کے پڑھائے جاتے تھے" [1]

پاگلوں اور دماغی بیماریوں کے علاج کا حکومت کی طرف سے جو انتظام مسلم ممالک میں موجود تھا اس کی کوئی نظیر رومی۔ یونانی اور عیسائی حکومتوں میں نہیں ملتی۔ لیسکی اس کے متعلق لکھتا ہے:۔

"اصل یہ ہے کہ اس باب خاص میں مسلمان مسیحیوں پر سبقت لے گئے۔ بنجمن آف ٹوڈیلا جس نے بغداد کی بارھویں صدی میں سیاحت کی تھی لکھتا ہے کہ اس شہر میں ایک خاص محل "دارالرحم" کے نام سے موسوم ہے جس میں تمام ممالک کے مجانین پابہ زنجیر رکھے جاتے ہیں۔ ہر مہینے ان کا معاینہ ہوتا ہے اور جو شفایاب

[1] ہسٹری آف دی عربس ص۵۶۳

ہوتے جاتے ہیں رہائی پاتے چلے جاتے ہیں۔ قاہرہ میں مسلمانوں نے پاگل خانہ
۱۳۰۴ء میں بنوایا۔ لیوڈ ایکنسی لکھتا ہے کہ سولھویں صدی
کی ابتداء میں شہر فیض میں بھی ایک پاگل خانہ موجود تھا اور یہ
بالکل قرین قیاس ہے کہ اس وقت دیوانوں اور پاگل خانوں
کی نگہداشت کا تمام اسلامی ممالک میں رائج تھا۔ خود مسیحیوں
میں یہ دستور اوّل اوّل انہی ممالک میں پھیلا جو اسلامی ممالک
کے متصل تھے۔" ۱؎

ہر عہد اور ہر ملک میں مسلم حکمرانوں کی یہ خصوصیت رہی کہ انہوں نے
جس ملک پر حکومت کی اس کو خوشنما اور خوشحال بنانے میں کوئی دقیقہ اُٹھا
نہیں رکھا۔ کیونکہ وہ مفتوحہ علاقے کو بھی اپنا وطن بنا لیتے تھے۔ اس لئے
ان ممالک میں بسنے والے افراد کا خون چوسنا اور ان ممالک کی دولت کو باہر
لے جانا کبھی ان کا نصب العین نہ ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اسپین، مصر اور
ہندوستان نے جیسی خوشحالی، مذہبی رواداری اور آزادی مسلم حکمرانوں کے عہد
میں دیکھی ہے۔ وہ کبھی ان کو نصیب نہ ہو سکی۔ اسپین میں مسلمانوں کے اخراج
کے بعد جو حالت رونما ہوئی اور پورا ملک قعر مذلت کی جس حد کو پہنچا اسکی
تفصیل لی بان نے اس طرح کی ہے:۔

"عربوں کے اخراج کے بعد اندلس کا تنزل اس قدر جلد ہوا کہ
کہا جا سکتا ہے کہ تاریخ میں کوئی مثال کسی ایسی قوم کی نہیں ہو

۱؎ تاریخ اخلاق یورپ جلد دوم صفحہ ۸۵

جو اس قدر جلد تنزل کر گئی ہو۔ علوم و فنون، صنعت و حرفت و زراعت اور کل وہ چیزیں جو قوم کو بڑھاتی ہیں دفعتہً غائب ہو گئیں۔ بڑے بڑے کارخانے بند ہو گئے۔ زمین کی کاشتکاری موقوف ہو گئی۔ اور خطے کے خطے بنجر ہو گئے۔ جس وقت حرفت و زراعت نہ رہی تو شہر بھی جو بغیر ان کے سرسبز نہ ہو سکتے تھے بہت جلد ویران ہو گئے۔ میڈرڈ کی مردم شماری جو چار لاکھ تھی دو لاکھ رہ گئی۔ اشبیلیہ میں جہاں سولہ سو کارخانے تھے جن میں ایک لاکھ تیس ہزار آدمی کام کرتے تھے کل تین سو کارخانے رہ گئے خود اس اطلاع سے جو مجلس قانون نے فلپ چہارم کے سامنے پیش کی معلوم ہوتا ہے کہ اس شہر میں چوتھائی باشندے رہ گئے تھے۔ سارے ملک کا یہی حال ہو گیا اور قرطبہ و سقوبیہ اور برگاس کے سے بڑے شہر گویا بالکل ویرانے ہو گئے۔ چند محدود حرفتیں جو عربوں کے بعد باقی رہ گئی تھیں وہ بھی بہت جلد تلف ہو گئیں۔ ملک کی حرفت اس درجہ تباہ ہو گئی کہ اٹھارھویں صدی کے اوائل میں جس وقت سقوبیہ میں کپڑے کا کارخانہ کھولا گیا تو کاریگروں کو ہالینڈ سے لانا پڑا۔ زراعت و حرفت کا اس سرعت کے ساتھ تباہ ہو جانا ایک مصیبت عظیمہ کا باعث ہوا اور چند سال کے اندر اندلس کا ملک تنزل شدید کے درجے کو پہنچ گیا۔ وہ کل سیاح جنہوں نے اس ملک کو اس زمانے میں دیکھا تھا ایک زبان ہیں کہ قوم

کی علمی حالت نہایت کم درجے پر پہنچ گئی تھی۔ سترھویں صدی
عیسوی کے اواخر میں جہالت نہ فقط عالمگیر تھی بلکہ شدید قسم کی
جہالت پھیلی ہوئی تھی۔ اس ملک میں جس نے عربوں کی حکومت
میں تمام دنیا میں روشنی پھیلائی تھی۔ ایک مدرسہ ایسا نہ تھا جہاں
علوم طبعی یا ریاضیات کی تعلیم ہوتی ہو۔ کمپوما نے ایک اندلسی
مصنف بیان کرتا ہے کہ سنہ ۱۷۶۶ء تک تمام ملک میں ایک بھی
دواساز ایسا نہ تھا جو عام ادویہ کو بنا سکے اور نہ کوئی ایسا تھا۔
جو جہاز تعمیر کر سکے یا ایک معمولی بادبان بھی بنا لے۔" [1]
بدقسمتی سے عیسائی حکمرانوں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف جذبۂ انتقام
و نفرت اس درجہ شاید تھا کہ ان کے تمدن آفریں طرز حکومت کے باوجود انہوں
نے مسلمانوں سے غداری اور بغاوت کو عین سعادت سمجھا فلسطین و اسپین
میں انہوں نے جس طرح مسلمانوں پر مظالم کئے اور ان کی خونریزی کو حلال
سمجھا اس سے نہ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد کے عیسائی اخلاقی حیثیت سے
کس قدر گر چکے تھے اور بچوں، عورتوں، بوڑھوں اور معصوم انسانوں کو وہ
کس بیدردی سے تہ تیغ کر سکتے تھے بلکہ اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ مسلمانوں
سے انتقام کے شوق میں نہ کسی تمدن کی پرواہ کرتے تھے اور نہ عوام کی خوشحالی
کی۔ اسی تعصب مذہبی کی بناء پر انہوں نے ہمیشہ مسلمانوں کے کارناموں
پر پانی پھیرنے کی کوشش کی۔ اس کا اعتراف لی بان اس طرح کرتا ہے:۔

---

[1] تمدن عرب صفحہ ۵۲۸، صفحہ ۵۲۹

"اس موروثی تعصب میں جو ہمیں اسلام کے خلاف ہے اگر ہم اس دوسرے تعصب کو شریک کر لیں جسے ہماری کم بخت تعلیم نے سالہائے دراز سے ہمارے ذہن نشین کر دیا ہے کہ کل قدیم علوم یونان و روم سے منتخب ہوئے ہیں تو بخوبی ہماری سمجھ میں آجائیگا کہ تمدن یورپ کی تاریخ میں عربوں کے حصے سے کیوں انکار کیا جاتا ہے۔ بعض اشخاص کو اس خیال سے ہمیشہ شرم آتی ہے کہ عیسائی یورپ کی وحشیانہ معاشرت سے نکلنے کے باعث ایک قوم کافر تھی۔ یہ خیال اس قدر دردناک ہے کہ اس سے انکار کرنا بہت ہی آسان ہو جاتا ہے" [1]

اسلام کے اثرات تمدن جدید پہ

مغربی اقوام اور مسلمانوں کے باہمی تصادم سے جو فلسطین و مصر اور اسپین اور ترکی میں مختلف اوقات میں صدیوں تک جاری رہا بلاشک تمام دنیا کو زبردست نقصان پہنچا۔ مغرب میں اسلام کے خلاف تعصبات پھیلتے گئے جس کی وجہ سے جدید مفکرین اور ماہرین علوم اور اسلام کے درمیان ابتک ایک ناقابل عبور خلیج حائل ہے۔ گزشتہ دو صدیوں سے علوم و فنون اور تحقیق و تمدن کی امامت مغربی اقوام کے حصے میں ہے۔ جس کی بدولت وہ آج تمام دنیا پر حکمران ہیں۔ لیکن چونکہ جدید مفکرین کے سامنے نہ کوئی اخلاقی معیار ہے نہ درست لائحہ عمل، اس لئے علم و تمدن

---

[1] تمدن عرب صـ ۵۲۳

کی تمام ترقیاں انسانیت کو ارتقاء کے بجائے انحطاط کی طرف لے جا رہی ہیں باوجودیکہ وہ کسی صحیح دستور حیات کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ لیکن موجودہ تمدنی ارتقاء کا ہر قدم اس کو ہلاکت اور تباہی کی طرف دھکیل رہا ہے۔ جو قومیں اسلام کے پیرو ہیں وہ علمی تحقیق اور سیاسی دور میں اس قدر پیچھے رہ گئی ہیں کہ ان میں نہ اتنی ہمت کہ خود اسلام کے پروگرام پر عامل ہو کر دنیا کے سامنے صحیح نمونہ پیش کر سکیں نہ اتنی صلاحیت کہ دوسری اقوام کے دلوں میں جو تعصبات اسلام کے خلاف پیدا ہو گئے ہیں ان کو دور کر سکیں نہ عیسائیت میں اتنی سکت باقی ہے کہ وہ سیاست اور اقتصادیات کی موجودہ پیچیدگیوں میں کوئی روشنی دے سکیں۔ گزشتہ بیس پچیس برس سے بالخصوص ادارۂ خلافت کے اعلان سقوط کے بعد سے اسلام کے خلاف تعصبات کم ہو چکے ہیں اور جدید مفکرین اسلامی تعلیمات کی گہرائیوں کا مطالعہ کرنے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔ لیکن جن لوگوں کو مغربی اقوام سے رابطہ اور میل جول کے مواقع حاصل ہیں وہ خود ان کے نظریات اور تعلیمات کو اپنا مذہب بنا چکے ہیں ان میں اتنی قدرت کہاں کہ وہ اسلامی نظام کو خود اپنے ممالک میں جاری کر کے مغرب کے سامنے ایک نمونہ پیش کر سکیں۔ لیکن ان تمام حالات کے باوجود مغربی ممالک اسلامی تعلیمات کے بعض پہلوؤں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ عیسائی کروسیڈروں نے اپنے وحشیانہ اور سفاکانہ مظالم اور اپنی بداخلاقیوں اور بے ایمانیوں کا مقابلہ اپنے دشمن مسلم مجاہدین اور ان کے سرداروں کے رحم دل اور منصفانہ طرز عمل سے کیا اور جب انہوں نے دیکھا

کہ عیسائیوں کی سخت اشتعال انگیز حرکات کے مقابلے میں بھی مسلمان مذہبی رواداری اور محبت و انسانیت کو ہاتھ سے نہیں دیتے تو ناممکن تھا کہ ان کے قلوب متاثر نہ ہوتے۔ اسپین کی سرزمین میں باہمی مساوات و اخوت اور دوسرے کے ساتھ محبت و عدل اور شخصی و انفرادی آزادی چشم دید حالات جب فرانس اور جرمنی کے راستوں سے مغرب میں پہنچے تو وہاں کے مفکرین ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ چودھویں، پندرھویں صدی عیسوی میں یوروپ انفرادی آزادی کے نام سے بھی واقف نہ تھا۔ وہاں کے افراد پوپ اور شہنشاہ کی دوہری غلامی میں اس حد تک گرفتار تھے کہ مہد سے لحد تک زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہ تھا کہ ان کی اسیری سے آزاد ہو سکتا۔ یہی نہیں بلکہ مرنے کے بعد بھی اگر پوپ کی طرف سے پروانۂ نجات نہ ملتا تو مردے کی روح کے متعلق یہی اعتقاد تھا کہ وہ ہمیشہ دوزخ میں رہے گی اگر چرچ اور اسٹیٹ میں باہمی رقابت اور رزم آرائی کی نوبت آئی تو اس لئے نہیں کہ افراد کو آزادی مل سکے بلکہ اس لئے کہ کس کو یہ حق زیادہ حاصل ہے کہ عوام پر حکومت کر سکے۔ مسلم تاریخ کے دور انحطاط میں بھی اخلاقی پستی اور افراد کی غلامی اس حد تک نہیں پہنچی تھی اس لئے فطری طور سے آزادی افراد اور حریت جمہور کے جذبات مسلمانوں سے مسلسل میل جول کے سبب مغربی حکماء نے حاصل کئے جن کو انہوں نے اپنے ممالک میں فروغ دینے کی کوشش کی۔ عہد جدید کی تحریکوں، جمہوریت، اشتراکیت اور فسطائیت کا سرسری مطالعہ اس حقیقت کو واضح کر دیتا ہے کہ ان میں سے ہر تحریک اسلام کے

کسی نہ کسی ایک جزو سے مستعار ہے۔ اور ان کے داعیان میں سے ہر ایک اسی راہ کا بھٹکا ہوا مسافر ہے۔

پس چہ باید کرد؟

بدقسمتی سے ان تمام مغربی تحریکوں میں کوئی اپنے اندر تعمیری پہلو نہیں رکھتی۔ ان میں سے ہر ایک کی بنیاد تخریب پر ہے۔ ہر تحریک اپنے عصر کے غلط نظام کے خلاف رد عمل کے طور سے ظہور میں آئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک باطل کی جگہ دوسرے باطل نے لے لی۔ انسانی مصائب کم ہونے کے بجائے برابر ترقی کرتے رہے۔ اگر ان کا کوئی اصولی نصب العین تھا بھی تو وہ وطنیت و قومیت کے تنگ نظر تخیل میں گرفتار ہو کر عالمگیر شکل اختیار نہ کر سکا۔ یہی وجہ ہے کہ جو تحریک جس ملک سے اٹھی وہ اسی ملک میں محدود ہو کر رہ گئی۔ جو اس امر کا صاف ثبوت ہے کہ درحقیقت یہ تحریکیں بنی نوع انسان کی نجات کے لئے نہیں بلکہ قومی استیلا، وطنی غلبہ اور جوع الارض و کشورستانی کی ہوس کو پورا کرنے کا حیلہ ہیں یہ اسی وطنی و قومی و رقابت اور حریفی مقابلہ کا نتیجہ ہے کہ آج تمام دنیا بطلان و فتن اور جدل و فساد کا شکار ہو رہی ہے۔ دوسری اقوام کو غلام بنانے کی باہمی رقابت ان تمام فتنوں کی جڑ ہے جن سے تمام انسانوں کو دوچار ہونا پڑ رہا ہے۔ آج یہ تمام مغربی تحریکیں بری طرح ایک دوسرے سے متصادم ہیں۔ جن کا لازمی نتیجہ ان کی آخری تباہی ہیں نمودار ہوتا نظر آ رہا ہے۔ کاش اب بھی عصر حاضر کے محققین اسلام کی طرف متوجہ ہو کر قرآنی پروگرام کو اپنا موضوع تحقیق بنائیں!

زمانہ تحقیق و تعمیر نو کی طرف بڑھ رہا ہے۔ انسان اس کرۂ ارض میں امن و آشتی کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ بین الاقوامی سیاسی اور علمی ادارے قوموں اور جماعتوں کے باہمی خوشگوار تعلقات اور مزدور و سرمایہ کے توازن اور آئینی و اقتصادی الجھنوں کے حل تلاش کرنے میں دن رات مصروف ہیں۔ ضرورت اس کی ہے کہ جد و جہد اور کشمکش کے اس دور اور تنازع اللبقار کی دوڑ میں مسلمان آگے بڑھیں اور ان مفکرین اور محققین کے سامنے جو روشنی کی تلاش میں تاریکی کی طرف بڑھتے چلے جا رہے ہیں اسلامی اور دستور قرآنی کا آفتاب بلند کر دیں۔

موجودہ انسان کی تمام بیماریوں کا صحیح حل صرف اسلام کے پاس ہے لیکن موجودہ دنیا اس پروگرام پر اس وقت تک عمل پیرا نہیں ہو سکتی جب تک صاف اور واضح طور سے ان کو بتا نہ دیا جائے کہ جس تمدن کو وہ اسلامی تمدن، جن علوم کو وہ اسلامی علوم سمجھ رہے ہیں اور جس نظام کا نام انہوں نے نظام اسلامی رکھ چھوڑا ہے وہ دراصل اسلامی نہیں ہے۔ اسلام کا اس سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ وہ عجمی اور رومی تہذیب و تمدن کا معجون مرکب ہے۔ جس کو مسلمانوں نے اپنے سیاسی اقتدار کے زمانے میں اپنا کر اسلامی تمدن کے نام سے پیش کر دیا ہے۔ وہ مسلمانوں کا ایک قومی یا نسلی تمدن تو ہو سکتا ہے جو دوسری اقوام کے مقابلے میں ہمیشہ بلند رہا ہے لیکن اسلام کا پیدا کردہ ماحول، تمدن اور نظام اس سے کہیں بلند اور برتر ہے ؎

بردل رواز مسلمانان، گر بزاند ر مسلمانی مسلماناں رو دارند کا فرما جرا ئیہا

جدید مفکرین کے دلوں سے تعصب اسی وقت دور ہو سکتا ہے اور خود وہ
مسلمان جو تقلید مغرب کو نصب العین بنا چکے ہیں۔ اس پروگرام کو اسی وقت
سمجھ سکتے ہیں جب ان کو معلوم ہو جائے کہ ملوکیت، ملائیت یا رہبانیت
اسلام کی پیداوار نہیں ہیں نہ آمریت، وطنیت اور اشتراکیت کا نام اسلام
ہے اس کے لئے ضرورت ہے کہ ہم اپنے ماضی پر تنقید کرنے کی جرأت
کریں۔ اسلاف کی غلطیوں پر پردہ ڈال کر اسلام کو بدنام کرنا چھوڑ دیں۔
اور تقلید جدید کے حدود توڑ کر صحیح اجتہاد کی بنیاد ڈالنے کی کوشش کریں۔
اسلام کو دنیا کے سامنے روشناس کرانے کے لئے ان تمام حجابات کو دور
کرنا لازم ہے۔ جو خود مسلمان حکمرانوں، ملاؤں اور خانقاہ نشین رہبانوں نے اسلام
کے چہرے پر ڈال رکھے ہیں گزشتہ قومی کارناموں پر تنقید کرنا قومی ہیروؤں
کی غلطیوں کی مذمت کرنا اور خود اپنی قوم کے غلط رجحانات کے خلاف جنگ
کرنا آسان کام نہیں ہے۔ لیکن ارتقاء انسانیت کی خاطر قیام حق اور
دفع باطل کے لئے اسلام کو تعصبات اور توہمات سے بچانے کے لئے یہ
سب کرنا ہوگا۔ صرف اسی وقت یہ ممکن ہے کہ یہ کرۂ کرۂ امن و آشتی
محبت و مساوات، رواداری اور عدل بن جائے اور تمام انسان نسل و
وطن اور رنگ و قوم کے اختلافات کے باوجود آپس میں بھائی بھائی بن کر
الخلق عیال اللہ کا سچا نمونہ بن جائیں۔

ختم شد

تاریخ افکار سیاسیات اسلامی

کے متعلق بعض مفکرین کے خیالات

مولینا عبید اللہ صاحب سندھی

میں محترم عبدالوحید خاں کو مبارک باد دیتا ہوں۔ کہ انہوں نے اپنی سیاسی اور علمی مطالعہ سے میرے خیال میں انگریزی تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لئے اس قسم کی ترقی کا دروازہ کھول دیا ہے ایک گریجویٹ کا جو سیاسی مطالعہ میں کافی شہرت حاصل کر چکا ہے۔ اس قسم کی کتاب لکھنا میری ایک انقلابی توقع پورا ہونے کی بشارت ہے۔

اس کتاب کے دلچسپ متفرق مقامات کے مطالعہ نے مجھے اس اعتراف پر مجبور کر دیا ہے کہ اس کے اکثر مباحث کی روح صحیح ہے بلکہ قابل تعریف ہے میرا خیال ہے کہ یہ کوشش ہمارے نوجوانوں کی طرف سے اسلامی علوم و فنون کے ریسرچ کی بہت اچھی ابتدا سمجھی جائیگی، ڈاکٹر اقبال کی دعوت جس دانشمند طبقہ نے قبول کی ہے۔ ہم اس کتاب کو اس کی فکری ترقی کا دوسرا قدم مانتے ہیں!

ہم پر زور سفارش کرتے ہیں کہ ہر متفکر نوجوان اسے بار بار پڑھے، اس کتاب میں مبتدی اور منتہی دونوں کے مطالعہ کے لئے کافی مواد جمع کیا گیا ہے۔

مولینا اسلم صاحب جیراجپوری

جہاں تک میرا علم ہے اس اہم موضوع پر اب تک اردو زبان میں کوئی کتاب

نہیں لکھی گئی۔ اور یہ اپنی نوعیت کی پہلی کوشش ہے، جس میں علمی اور سیاسی افکار واضح طور پر بیان کئے گئے ہیں۔ مولف نے بڑی محنت و جستجو سے اس کا مواد فراہم کیا ہے۔ اور نہایت صحیح علمی ذوق اور قابلیت کے ساتھ اس کو مرتب کیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ کتاب علمی حلقوں میں مقبول اور ملت کے لئے مفید ہو گی، اور نئے تعلیم یافتہ طبقے کے لئے ایک اساس کا کام دے گی، جس کے اوپر وہ اپنے افکار کی بنیاد رکھ سکیں۔

مدینہ اخبار علمی و فنی کتابوں میں ابتک چند ہی ایسی کتابیں ہمارے مطالعہ میں آئی ہیں جن کی لذت روح میں اب تک موجود ہے اور ہمیشہ موجود رہیگی، اور جنہوں نے ایک نئی روش اور کامیاب راہ دیدۂ اعتبار سے سامنے کھولی۔ .... آج بھی کیفیت اس "تاریخ افکار و سیاسیات اسلامی" کے مطالعے سے قلب و دماغ پر طاری ہو رہی ہے۔ ہمیں دنیا میں چھپنے والی کتابوں کے اسمار کا اعادہ نہیں، اس لئے نہیں کہا جا سکتا۔ کہ اس قسم کی تصنیف کے علاوہ بھی کوئی اور ہے یا نہیں؟ البتہ پورے وثوق و یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اردو میں یہ اپنی قسم کی پہلی کوشش ہے۔ چونکہ یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں اس لئے ہم صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ ہر وہ مسلمان جو اسلام و اسلامیات کو سمجھنا چاہتا ہے اور جو صحیح معنی میں مسلمان بننے کا آرزومند ہے اسے چھ سو صفحے کی اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیئے۔

ریاض احمد بشیر پبلشرز یونائیٹڈ نے استقلال پریس میں چھپوا کر چوک انارکلی لاہور سے شائع کیا